الکلام
Al kalam

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میگزین

نومبر 2016 شمارہ XXIV

مولانا آزاد
خصوصی شمارہ

شیخ الجامعہ کے قلم سے.....

مولانا آزاد کی معنویت

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

عزیز قارئین!

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ تحریکِ آزادی کے صفِ اول کے رہنما کے نظریات کو فروغ دینے کی غرض سے ہم ہر سال یومِ آزاد تقاریب کا اہتمام کررہے ہیں۔

یونیورسٹی کے جریدے ''الکلام'' کا یہ خصوصی شمارہ اس عظیم رہنما کی شخصیت پر محیط ہے۔ مولانا آزاد کی حیات، شخصیت، فکر اور خدمات کے متنوع موضوعات پر لکھنے لکھانے کے تئیں اندرون یونیورسٹی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔ اس شمارے میں شامل نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے میرا یہ احساس ہے کہ وہ دن دور نہیں جب ہمارے قارئین ''الکلام'' کے اگلے خصوصی شمارے کا بے صبری سے انتظار کریں گے۔

مولانا آزاد کے نظریات کی بڑے پیمانے پر اور وسیع تر تشہیر کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارا یہ ایقان کیوں ہے کہ مولانا آزاد کا ''نظریۂ ہندوستان'' ہمہ گیر معنویت اور تقلید کا حامل ہے؟ ان سوالات کا جواب سیدھا تو ہے مگر آسان نہیں۔

تمام ہندوستانی مولانا آزاد کے مخاطب تھے تاہم مسلمانوں پر اُن کی خصوصی توجہ تھی جو روایات اور بدلتے وقت کے تقاضوں کے درمیان الجھ کر رہ گئے تھے۔ مولانا نے محسوس کیا کہ حال کا ادراک اور مستقبل کی آواز پر لبیک کہنا مسلمانوں کے لیے امرِ دشوار ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ مولانا آزاد اپنے وقت سے کافی آگے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے ہم مذہبوں کو نوشتۂ دیوار سمجھانے میں کافی دقت ہوئی۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا کے دور میں ملک کو جن مسائل اور مخمصوں کا سامنا کرنا پڑا، اُن میں سے بعض آج تک بھی برقرار ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر مسائل نے گذشتہ 70 برس کی مختلف سماجی، سیاسی، معاشی اور تکنیکی تبدیلیوں کے نتیجے میں مزید سنگین شکل اختیار کرلی ہے۔ ان حالات میں لازم ہے کہ ہم مولانا آزاد اور اُن کی منفرد قومی شناخت پر فخر کے احساس کے ساتھ ساتھ قوم کے تنوع کا شعوری ادراک کریں جو مولانا آزاد کی فکر کا طرۂ امتیاز تھا۔

مولانا کی شخصیت کو اگر ہم موجودہ ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی زائد از ایک ہزار سالہ تاریخ کی ایک قدآور ترین مثال اور اُس کا حامی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ دیگر مذاہب، عقائد اور نکاتِ نظر کے تئیں مولانا کی رواداری کسی سیاسی مجبوری کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ ہندوستان کی تاریخ اور مشترکہ کلچر سے متعلق اُن کے گہرے شعور کا ادراک تھا۔ ہندوستان کی رواداری، اس ملک کے عوام الناس کی صدیوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مولانا آزاد تادم آخر اس مشترکہ طرز حیات کی روشن مثال رہے۔ انھوں نے ایک ایسے وقت بھی اپنے نظریات پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جب اُن کے کئی بلند قامت ہم عصر قائدین کے قدم بھی متزلزل ہوگئے۔ یہی مولانا آزاد کی عظمت ہے۔ یہی خوبی انھیں نہ صرف آج بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی معنویت عطا کرتی ہے۔

یہ ہماری یونیورسٹی کی خوش بختی ہے کہ یہ مولانا آزاد جیسی عبقری شخصیت کے نام سے موسوم ہے۔ مولانا آزاد سے یہ نسبت ہم پر بہت سی ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔ مولانا آزاد کی طرح مانو کو بھی اُن راستوں کی نشاندہی کرنی ہوگی جہاں کوئی اور دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔ ہمیں اُن لوگوں کا مستقبل بہتر بنانے کی کوشش کرنی ہوگی جو برسہا برس سے دوراہے پر کھڑے ہیں اور انھیں یہی نہیں معلوم کہ کدھر جائیں۔ یہ کہنا آسان ہے مگر کرنا مشکل۔ اس کارِ عظیم کے آغاز سے قبل ہمیں خود کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہوگا۔ مولانا آزاد ہی کی طرح ہمارے درد اور ہماری ذمہ داری دونوں کی نوعیت منفرد ہے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ہمیں عوامی اُمنگوں اور توقعات کی نمائندگی کرنے والی ہندوستان کی پارلیمنٹ کے تفویض کردہ دائرہ کار کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

مولانا کی ہمہ جہت شخصیت سے ہم سب واقف ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انہیں اپنے ذوق کے ہر میدان میں اس قدر ملکہ حاصل تھا کہ اُس کا عشرِ عشیر بھی حاصل کرنا اس شعبے کے ماہرین کے لیے شاید جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ہم نے جس انداز میں آغاز کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ ''الکلام'' کے مستقبل کے شماروں میں مولانا آزاد کی زندگی اور افکار کی مزید مختلف جہتیں سامنے آئیں گی۔ ایک ایسے سفر کی سمت جو مانو کا مقدر ہے، یہ چھوٹا مگر اہم قدم ہے۔

مولانا آزاد اور ٹکنیکل ایجوکیشن

پروفیسر وہاب قیصر

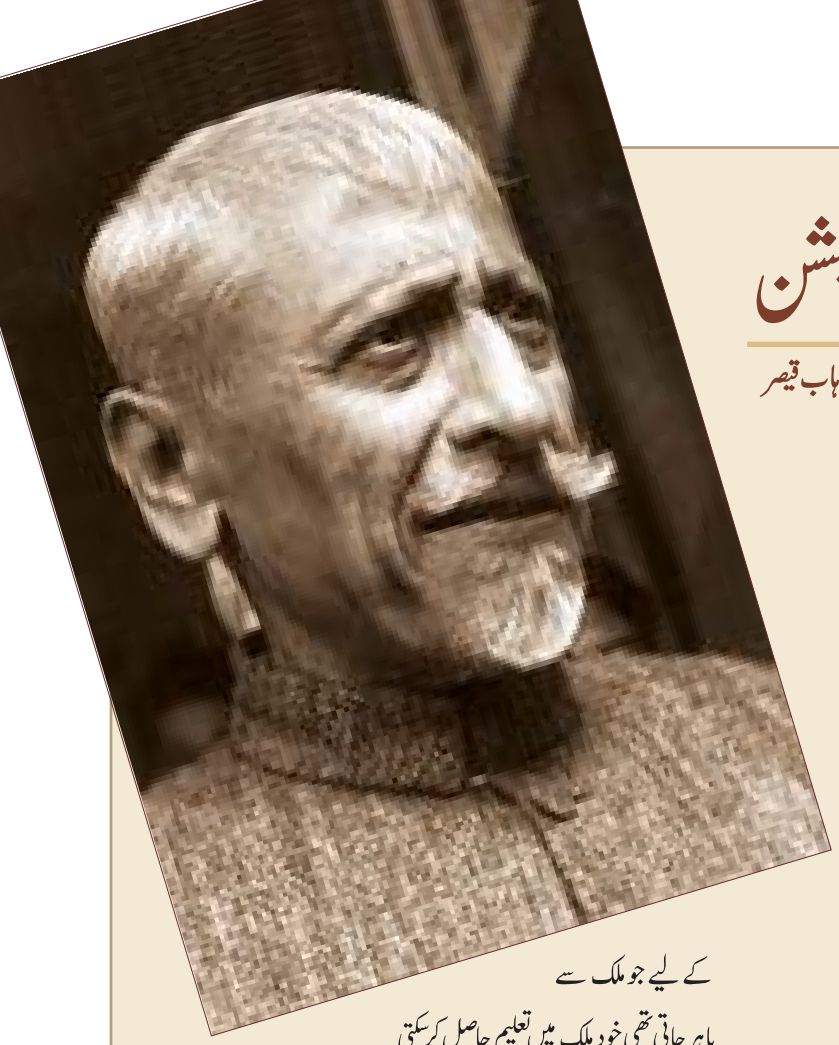

سالہا سال کی جدو جہد آزادی کے بعد ستمبر 1946 میں ملک میں عبوری حکومت قائم ہوئی۔ ابتدا میں مولانا آزاد مجلس وزارت میں شامل نہیں تھے۔ پنڈت نہرو کے اصرار پر جنوری 1947ء میں انہوں نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے حکومت میں شمولیت اختیار کی۔ بعد میں سائنس اور کلچر کی زائد ذمہ داری ان کو تفویض کی گئی۔ 1952 کے پہلے عام انتخابات کے بعد مولانا آزاد کو تعلیم، قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیقات کے قلم دان سونپے گئے۔ 1957 کے دوسرے عام انتخابات کے بعد وہ دوبارہ تعلیم وسائنسی تحقیقات کی وزارت پر فائز ہوئے۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کو شدت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ ٹکنیکل ایجوکیشن کے بغیر ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہوسکتی۔ اگر معاشی ترقی کی رفتار میں اضافہ مقصود ہو تو ٹکنیکل ایجوکیشن میں توسیع بے حد ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس بات پر مستقل نظر رکھی جائے کہ آئندہ ہماری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کتنے فنی ماہرین کی ضرورت پیش آئے گی۔ چنانچہ ملک کی آزادی کے ساتھ ہی مولانا آزاد کی سرپرستی میں Scientific Manpower Committee کا قیام عمل میں آیا اور حرکیاتی سائنسداں ڈاکٹر بھٹناگر کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ کمیٹی کو اس بات کا پتہ لگانا تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تحقیق کے میدان میں 1947 سے 1957 تک ملک میں کتنے تکنیکی عملے کی ضرورت پیش آئے گی اور اس کی پابجائی کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کمیٹی نے ملک میں ٹکنیکل ایجوکیشن کے فروغ کے لیے ایک پنج سالہ منصوبے کی سفارش بھی کی تھی۔

مولانا آزاد نے ملک کی یونیورسٹیز، ٹکنیکل انسٹی ٹیوشنز اور انڈسٹریز میں ایک مناسب رابطہ کی ضرورت کو ناگزیر قرار دیا تھا۔ انہوں نے ٹکنیکل ایجوکیشن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اپنی بیشتر تقریروں میں کیا تھا۔ چنانچہ 1951 میں اپنے ایک خطاب میں ٹکنیکل ایجوکیشن سے متعلق وہ کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''وزارت تعلیمات کا جائزہ حاصل کرتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ ٹکنیکل ایجوکیشن کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے جو ملک سے باہر جاتی تھی خود ملک میں تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ میں اس دن کا منتظر تھا اور اب بھی ہوں جب ہندوستان میں ٹکنیکل ایجوکیشن کی سطح اتنی بلند ہوجائے کہ باہر سے لوگ ہندوستان اس غرض سے آئیں گے کہ یہاں اعلیٰ سائنس اور ٹکنیکل ایجوکیشن و ٹریننگ حاصل کریں۔''

مولانا آزاد نے اپنے خواب کی تکمیل کے لیے کئی ٹھوس قدم اٹھائے۔ ان میں ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC)، میڈیکل تعلیم کے لیے انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ (ICMR) اور اگریکلچر کی تعلیم کے لیے انڈین کونسل فار اگریکلچرل ریسرچ (ICAR) جیسے اعلیٰ سطح کے اداروں کا قیام قابل ذکر ہے۔ ملک میں سائنسی اور صنعتی تحقیق کو فروغ دینے کے لیے 1942 میں کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) قائم کیا گیا تھا اور وہ ایک غیر فعال ادارہ بن کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے اس کو نہ صرف فعال بنایا بلکہ اس کے تحت 12 قومی ادارے قائم کیے جن میں سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور الکٹرانک انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قابل ذکر ہیں۔

ملک میں کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) کے توسیعی کام

1949 ہی سے شروع کیے گئے تھے۔ پنڈت نہرو بحیثیت وزیر اعظم اس کے صدر اور مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم اس کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ پنڈت نہرو اس کی تمام تر ترقی کے ذمہ دار تھے اور مولانا آزاد اس کے روز بروز کے معمولات کے علاوہ اس کے طویل مدتی منصوبوں میں شریک رہے۔ مولانا نے CSIR کے لیے سائنس اور انڈسٹریز کے انفراسٹرکچر کی ترقی کو جو سمت بخشی تھی وہ لائق تحسین ہے۔ بقول خود ان کے ''وہ CSIR کے امور میں بحیثیت وزیر نہیں بلکہ بحیثیت عہدیدار شامل رہتے''۔

ہندوستان میں سارجنٹ رپورٹ کو تسلیم کرتے ہوئے 1945 میں نیشنل کونسل فار ٹکنیکل ایجوکیشن قائم کیا گیا تھا تاکہ یہاں ٹکنیکل ایجوکیشن کو فروغ حاصل ہو۔ 1953 میں اس کونسل کے دستور میں ترمیم کی گئی اور مولانا آزاد کو بحیثیت وزیر تعلیم اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ جس پر انہوں نے اس کونسل کی تنظیم جدید کی اور ملک میں ٹکنیکل ایجوکیشن کے انسٹی ٹیوشنز کا ایک جال سا بچھا دیا۔

ٹکنیکل ایجوکشین اور اس کی تربیت کے لیے مولانا آزاد کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے 1951 میں کھڑگ پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی کے قیام کو عملی شکل دی جس نے بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی IIT کھڑگ پور کے نام سے ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔ اس ادارے میں انجینئرنگ کے بنیادی کورسز میں داخلوں کے ساتھ Civil Architectural Engineering اور آرکیٹیکچر کی ڈگریوں کے لیے بھی داخلے دیے جاتے تھے۔ یہاں پروڈکشن انجینئرنگ اور Combustion Engineering میں پوسٹ گریجویشن کورسز بھی شروع کیے گئے۔ اس ادارے میں Management Studies میں مختصر مدتی کورس بھی شروع کیا گیا تھا جو ان دنوں سارے ایشیا میں اپنی نوعیت کا واحد کورس تھا۔ اس طرح مولانا آزاد کے دور وزارت ہی میں IIT کھڑگ پور جیسے ایک چھوٹے سے ادارے نے بہت بڑے ادارے کی شکل اختیار کر لی تھی۔

مولانا آزاد نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور کو وسعت دیتے ہوئے اس کو تیزی کے ساتھ ترقی کی سمت گامزن کیا۔ ان کے دورِ وزارت ہی میں یہ ادارہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس میں ہوا بازی سے متعلق ایرو ناٹیکل انجینئرنگ، اندرونی احتراق سے متعلق Internal Combustion Engineering، خام دھاتوں کو صاف کرنے سے متعلق Metallurgy اور پاور انجینئرنگ کے شعبے قائم کیے گئے تاکہ نوجوانوں کو ان میدانوں میں تعلیم، تربیت اور تحقیق کی سہولتیں مہیا کی جا سکیں۔ اس ادارے کا ایک اور مقصد یہ بھی رہا کہ الکٹریکل انجینئرنگ کے گریجویٹس کو برقی قوت کے Production and Transformation کی نہایت اعلیٰ تعلیم دی جائے۔

مولانا آزاد اپنی تقریروں میں چاہے وہ ٹکنیکل ایجوکیشن کی کل ہند مجلس میں ہو یا ہندوستانی قومی کمیشن کے جلسوں میں، چاہے ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں ہو یا مختلف اداروں کے یوم تاسیس پر، سننے والوں میں اس امر کا شعور پیدا کیا کرتے کہ تعلیم ہی منصوبہ بندی کی کامیابی کی اساس ہے اور ٹکنیکل ایجوکشین کو ہر سطح پر رائج کیے بغیر نہ ملک میں صنعتی ترقی ہو سکتی ہے اور نہ ان صنعتوں کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے دورِ وزارت میں راہ کی مشکلوں، مالیہ کے فقدان، موزوں ماہرین کی کمی اور مختلف اقسام کے انفرا اسٹرکچرز کی قلت کے باوجود ملک میں ٹکنیکل ایجوکیشن کی توسیع کے لیے جٹے رہے۔ ٹکنیکل ایجوکشین کے فروغ کے معاملہ میں وہ ہر قسم کی مدد کے لیے تیار رہتے، چاہے وہ بلڈنگس کی توسیع کی شکل میں ہو یا چاہے وہ مشینوں کی فراہمی کی شکل میں ہو۔ ٹکنیکل ایجوکیشن کے ماہر اساتذہ کی بھرتی کرنے کے معاملہ میں انہوں نے کبھی بھی کوتاہی نہیں کی۔ اس سلسلے میں وہ مقامی ارباب اقتدار کی ہر ممکنہ مدد کیا کرتے تھے۔

1956 تا 1961 دوسرے پنج سالہ منصوبے میں ریاستی اور مرکزی وزارت تعلیمات کے لیے نیشنل کونسل فار ٹکنیکل ایجوکیشن اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی منظورہ تجاویز کی عمل آوری کے لیے 57 کروڑ 37 لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی تاکہ آئی آئی ٹی کھڑگ پور، دہلی پالی ٹکنک اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کی ترقی کے علاوہ 19 انجینئرنگ کالجس، 71 پالی ٹکنکس اور 60 چھوٹے ٹکنیکل اسکولس کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ اس منصوبے کے دوران 22 فروری 1958 کو مولانا آزاد کا سانحہ ارتحال ہو گیا اور وہ یہ سارے کام اپنی راست نگرانی میں کروا نہ سکے۔

پروفیسر وہاب قیصر، نظامت ترجمہ و اشاعت سے وابستہ ہیں۔

مولانا آزاد کی تحریروں پر عربی اثرات کے بعض وجوہ

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی ایسی عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیت کا نام ہے جس کی ذات میں عالم وادیب، مفکر وخطیب، صحافی وشاعر اور قائد وسیاستداں سب جمع ہوگئے ہیں۔ اوران کی ذات ہی کی طرح ان کے تمام اوصاف بھی امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ لہٰذا ان کے اسلوب کی انفرادیت بھی کسی حیرت واستعجاب کا باعث نہیں ہوسکتی ہے۔ اوران کے اسلوب تحریر کا سب سے نمایاں پہلو اس پر عربی زبان کا غیر معمولی اثر ہونا ہے۔

اس مختصر مضمون کا مقصد نہ آزاد کی تحریروں کی تفہیم اوران کا تعین قدر ہے نہ ان کے نثری اسالیب کا بیان۔ اس کا مقصد صرف اور صرف مولانا کی تحریروں پر عربی اثرات کے بعض وجوہ کا ذکر کرنا ہے اوران کا احاطہ وحصر بھی مطلوب نہیں ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں پر عربی اثرات کا نمایاں اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

1. مادری زبان کا عربی ہونا ، 2- عربی زبان وادب پر زبردست قدرت، 3- استعلائی و برترانہ طبیعت، 4- مضامین کے موضوعات، 5- خطیبانہ اسلوب اور 6۔فکر کی منطقیت۔

دینی موضوعات پر مشتمل مولانا کی تحریروں پر عربی اثرات کی کثرت کا تقریباً سبھی نے ذکر کیا ہے۔ اوراس کے دو اسباب ہیں ایک تو موضوع کا تقاضہ اور دوسرے

متکلم کا یہ احساس کہ مخاطب عربی جاننے والا ہے۔

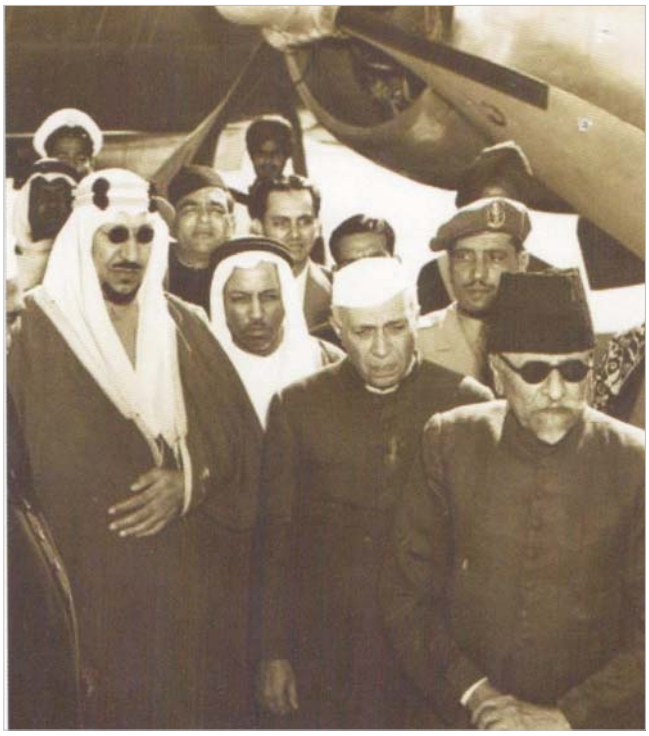

مولانا آزاد کی تحریروں میں عربی اثرات کی کئی جہتیں ہیں جن میں سب سے نمایاں قرآن کریم سے اقتباس ہے۔ مولانا اپنی تحریروں میں جس قدر کثرت اور برجستگی کے ساتھ قرآن سے اقتباس کرتے ہیں وہ ان کے اسلوب کی امتیازی شان ہے۔

تذکرہ میں وارد قرآنی آیات کی تعداد تین سو سے متجاوز ہے۔ جن کی فہرست مرتب کرنے میں مالک رام صاحب کو اٹھارہ صفحات خرچ کرنے پڑے ہیں۔ غبار خاطر جسے ان کی نثری سلاست کی معراج کہا جاتا ہے اس میں بھی دو درجن سے زائد قرآنی آیات کا استعمال کیا گیا ہے اور بعض آیات کو کئی کئی بار ذکر کیا گیا ہے۔

قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ حدیثوں کا کثرت سے استعمال ان کی تحریروں پر عربی اثرات کو گہرا کرتا ہے۔ تذکرہ میں مالک رام صاحب کی دی گئی فہرست کے مطابق صرف اسی ایک کتاب میں مولانا نے سو سے زیادہ احادیث کا ذکر کیا ہے واضح رہے کہ مولانا نے جن احوال میں یہ کتاب لکھی ہے اس میں حدیثی ماخذ یقیناً ان کی دسترس سے باہر رہے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ ان احادیث کے ساتھ کہیں کہیں کتاب کا نام تک درج نہیں ہے۔ بعض احادیث کو نقل کرنے کے بعد" أو کما قال "بھی لکھتے ہیں یعنی یا جیسا فرمایا ہے۔

عربی اشعار کا بے تکلف استعمال ان کی تحریروں پر عربی اثرات کی تیسری جہت ہے۔ اشعار کا استعمال اردو کی کتابوں میں عام طور پر ہوتا رہا ہے مگر یہ اشعار عموماً فارسی کے ہوتے تھے۔ عربی اشعار اردو کتابوں میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد عربی اشعار کو اتنے بڑے پیمانے پر استعمال کرنے والے پہلے اردو ادیب ومصنف ہیں۔ تذکرہ میں مولانا نے ایک سو بیس (120) سے زیادہ عربی اشعار کا استعمال کیا ہے۔ غبار خاطر میں بھی دو درجن سے زائد اشعار وارد ہوئے ہیں۔ حتی کہ چڑیا چڑے کی کہانی میں بھی عربی کے دو شعر آگئے ہیں۔

غیر معمولی قوت حافظہ کے سبب انہیں فارسی وعربی کے بے شمار اشعار یاد تھے وہ اپنی تحریروں میں اشعار کے استعمال کے دلدادہ بھی تھے۔ لہٰذا صرف ادنیٰ سی مناسبت سے بھی وہ شعر لکھ دیتے تھے۔ خلیق انجم صاحب کے خیال میں تو: "کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے شعر ذہن میں آیا پھر اس سے متعلق نثر لکھ دی گئی۔" بلکہ اس سے بھی آگے کبھی کبھی بغیر کسی معنوی مناسبت کے صرف لفظی مناسبت پر اکتفا کرتے ہوئے شعر لکھ ڈالتے ہیں۔

عربی اشعار واقوال، آیات واحادیث کی مثالیں دوسرے مصنفین کے یہاں بھی

مل جاتی ہیں اگر چہ اس کثرت سے نہ بھی ہو لیکن پھر بھی دینی و ادبی کتابوں میں موضوع کی مناسبت سے اور متقضائے حال سے یہ چیزیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن مولانا آزاد کی تحریروں میں عربی اثرات کی ایک ایسی جہت ہے جو صرف مولانا کے ساتھ خاص اور اس کی کوئی دوسری مثال اردو میں نہیں ملتی ہے اور وہ ہے ان کی تحریروں میں عربی کے عام اور سادہ جملوں کا استعمال اور جو سیاق عبارت کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ جملے ان کی تحریروں میں اس کثرت سے ہیں جو راست طور پر ان کے اسلوب نگارش کو متاثر کرتے ہیں:

1. ''میری طرف دیکھو میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا ہے اور لوٹ لوٹ کے پکار رہا ہوں۔ و **لکن لاتحبون الناصحین**'' (لیکن تم لوگ نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو۔
2. ''الہلال کا دائرہ بحث تو صرف ایک ہے یعنی احیاء تعلیم اسلامی اور اتباع ماجاء به القرآن''
3. ''چائے دانی اس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکم وضع الشیئ فی محله یہی اس کا محل صحیح ہونا چاہئیے مگر فنجان اور شکر دانی کے لیے اس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ وضع الشیئ فی غیر محلہ میں داخل ہو جاتا''۔

ماورائے وجدانی علم کے بارے میں لکھتے ہیں:

4. ''وہاں ایک ایسی آگ ہے جو دیکھی نہیں جاسکتی البتہ اس کی گرمی سے ہاتھ تاپ لیے جاسکتے ہیں و من لم یذق لم یدر''

ایسا لگتا ہے کہ وہ عربی میں سوچتے ہیں اور اس کے بعد اردو میں ترجمہ کر کے لکھتے ہیں اور پھر کبھی بے اختیاری میں اور کبھی اختیار کے ساتھ عربی میں سوچی ہوئی عبارت کو بعینہ لکھ دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات عربی میں سوچی عبارت کو بغیر اردو روزمرہ کی رعایت کے لفظی طور پر اردو میں منتقل کر دیتے ہیں ایسی اردو عبارتیں عام اردو اسالیب سے مختلف ہو جاتی ہیں۔ بلکہ ایسی اردو عبارتوں کو عربی اثرات کی ایک مستقل جہت قرار دیا جاسکتا ہے۔ غبار خاطر میں لکھتے ہیں کہ: ''آنے والی زندگی سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا۔'' پھر عربی کا ایک شعر لکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ: ''یہاں 'پہلا سابقہ' لکھتے ہوئے عربی کی ترکیب ' کان أول عهدی بها ' کا بلا قصد ترجمہ کر دیا کہ دماغ میں بسی ہوئی تھی۔''

ان کی تحریروں میں عربی اثرات کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ عربی جملوں اور فقروں کو اپنے اردو مقالات کا سرنامۂ سخن بناتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں: الہلال کی 7 مئی 1913ء کی اشاعت میں ایک مقالے کا عنوان'' یا قومنا أجیبوا داعي الله '' (اے میری قوم کے لوگو ! خدا کی طرف بلانے والے کو لبیک کہو)

مولانا آزاد کی تحریروں میں عربی اثرات کی آخری اہم جہت اس میں پائے جانے والے عربی مفردات کی کثرت ہے۔ یہاں عربی مفردات سے وہ الفاظ مراد نہیں ہیں جو ہماری زبان کا حصہ ہیں بلکہ وہ عربی الفاظ مراد ہیں جو ہماری زبان میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ اور عموماً اردو لغات کا بھی حصہ نہیں ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی تحریروں میں ہزاروں ہزار عربی الفاظ کا استعمال کیا ہے ان میں سے کئی ایک ایسے بھی ہیں جو ان کی تحریروں کے توسط سے ہمیشہ کے لیے اردو زبان کا حصہ بن گئے۔ اور ان الفاظ کی کثرت و قلت موضوع، سامعین و قارئین اور اسلوب کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن ان کی تحریر ان الفاظ سے خالی نہیں ہے۔ وہ تحریر تذکرے کی ہو، خطبات کی ہو یا غبار خاطر کی۔

ہندوستان کے اردو دانوں کے لئے یہ طرز بیان اور اسلوب نگارش ایک نئی چیز تھی ہر چہار جانب اس کا غلغلہ اٹھنے لگا، ایسا نہیں تھا کہ یہاں عربی جاننے والے نہیں تھے مگر ان کی عربی عصر جاہلی اور اسلامی کی عربی تھی کچھ صاحب ذوق عباسی و مملوکی عہد کے شعراء و ادباء سے بھی واقف تھے لیکن مولانا کی تحریروں میں مصر پر نپولین کے حملے (۱۷۹۷ء) کے بعد والی عربی کے اثرات تھے جو اس عہد کی جدید ترین زبان تھی اس نے سبھی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ان ہندوستانی علما و فضلا اور ادبا و شعرا کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۱۲ء میں الہلال افق کلکتہ سے طلوع ہوا... سرورق پر اڈیٹر کا نام یوں درج ہوتا احمد المکنی بأبی الکلام الدہلوی، المکنی کے صحیح تلفظ اور معنی کے لئے صراح و قاموس کی گردان کرنی پڑی اور اڈیٹر کہاں مدیر مسئول، محرر خصوصی اور رئیس قلم، تحریر، جریدہ کی جگہ مجلّہ اور ولایتی ڈاک کی جگہ برید فرنگ، حیرت انگیز کی جگہ محیر العقول قسم کے نہ جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات، نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں اور نئے اسلوب ہر ہفتے اس ادبی اور علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے۔ حالی و شبلی کی سلاست و سادگی سر پیٹتی رہی اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق سب ہائے ہائے کرتے رہ گئے''۔

لیکن مولانا کی اس طرز نگارش سے اردو حلقے میں ایک غلط فہمی بھی پیدا ہوئی کہ یہ تمام جدید علمی اور صحافتی اصطلاحات جو مولانا آزاد کی تحروں میں ملتی ہیں وہ سب انھیں کی وضع کردہ ہیں لیکن یہ بات علی العموم خلاف واقعہ ہے، مولانا دریابادی کی تحریر سے بھی یہ مترشح ہے اور بہت سے اردو داں حضرات نے تو اس کی صراحت بھی کی ہے ان میں سرفہرست استاد گرامی پروفیسر عبدالوہاب قیصر صاحب ہیں جنھوں نے اپنی کئی کتابوں میں اس بات کا ذکر کیا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں استعمال شدہ جدید مصطلحات ہوں یا نئی لفظیات و ترکیبات ہوں وہ سب مصر و لبنان سے شائع ہونے والے جرائد و مجلّات میں زمانے سے استعمال ہو رہی تھیں بلکہ ان میں بہت ساری اصطلاحات اور ترکیبات مولانا کی پیدائش سے قبل معروف تھیں، البتہ اردو زبان کو ان سے آشنا کرنے کا سہرا مولانا آزاد کے سر ضرور جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی صدر شعبۂ عربی ہیں

مولانا آزاد کا نظریہ متحدہ قومیت

ڈاکٹر عبدالقیوم

ہندوستان کی قوم پرستانہ جدو جہد آزادی کے اہم ستونوں میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد، جدید ہندوستان کے سیکولر کردار کی ایک ایسی واضح تصویر ہیں، جو ماضی کے دھندلکے میں نہ تو ماند پڑ سکتی ہے اور نہ ہی مستقبل کی تبدیلیاں انہیں نظر انداز کر سکتی ہیں۔

مولانا آزاد دوٹوک سیاستدان تھے، سیاسی مصلحت شاید ان کے قریب سے بھی نہ گزری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب بہت سے دوسرے پایہ کے سیاستدان ہندوستانی قوم پرستی اور قومیت کے معاملے میں تقسیم ہند کے قائل ہو گئے تھے وہیں ابوالکلام آزاد نے اپنے نظریہ قومیت سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور وہ تقسیم ہند کے لیے کسی طور تیار نہیں ہوئے۔ بلکہ جامع مسجد میں دیئے گئے ان کے خطبے نے لوگوں کے قدم روک لیے اور وہ بالآخر اس بات کے قائل ہو گئے کہ ہندوستان ہی ان کا وطن ہے۔

مولانا آزاد نہ تو اپنے مذہب اور نہ ہی ہندوستانی روایتوں، قوم پرستانہ جذبات و احساسات سے ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہ صرف ایک راسخ العقیدہ پکے مذہبی انسان تھے بلکہ اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے۔ انہیں اس بات پر بھی فخر تھا کہ وہ ایک ہندوستانی ہیں۔ خود ان کے الفاظ میں ''میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندوستانی قومیت میں شامل ہوں۔'' شورش کاشمیری کے مرتبہ ''خطبات آزاد'' (لاہور 1944ء) میں مولانا آزاد کا نظریہ قومیت وقوم پرستی خود ان کے الفاظ میں اس طرح بیان ہوا ہے، ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان میں مذہبی و کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان، ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعویٰ سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔''

مولانا آزاد کے نزدیک ہندوستانی قوم پرستی کی بنیادیں 1857ء کے غدر میں پیوست ہیں۔ جس میں عوام بلا تخصیص مذہب وملت، ذات، برادری، نسل، اپنے ہندوستانی ہونے کے اظہار کے لیے نو آبادیاتی حکمرانوں کے خلاف ایک متحدہ وحدت وطاقت بن کر اٹھے تھے اور وہی جذبہ حب الوطنی ہندوستانی قومیت یا قوم پرستی کو ظاہر کرتا ہے۔ دستور ہند کی فلسفیانہ بنیادیں اور بنیادی حقوق کا باب ہندوستانی قومیت کے اظہار کے لیے مذہب، ذات، نسل، تہذیب یا زبان کو بنیاد نہیں بناتے۔ بلکہ اس کا مقصد تمام شہریوں میں آزادی، مساوات اور انصاف کی بنیاد پر اخوت و بھائی چارگی کو فروغ دینا تھا۔ دستور ہند کے یہ تصورات مولانا آزاد کے فکر ونظریہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مولانا آزاد بین مذہبی اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اس لیے وہ بین مذہبی اتحاد کی قیمت پر آزادی حاصل کرنے کے حامی نہیں تھے۔ مولانا آزاد کے نظریہ قوم پرستی یا حب الوطنی کے اہم اجزاء سوراج، آزادی، فرقہ وارانہ اتحاد اور عدم تشدد تھے۔

مولانا آزاد نے سوراج کے لیے متحدہ جدو جہد پر زور دیا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہماری جدوجہد کی بنیاد ہندو-مسلم اتحاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور کرنے کی ہو سکتی ہیں محض خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا آزاد کے نزدیک ہندوستانی قوم پرستی اور ہندو-مسلم اتحاد کے دو رخ تھے۔ انہوں نے بہ بانگ دہل کہا تھا کہ ''اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر کہے کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر سوراج مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان، ہندو-مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں

سواراج سے دست بردار ہوجاؤں گا۔لیکن اتحاد سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ کیونکہ سواراج ملنے میں اگر دیر ہوتو اس میں ہندوستان کا نقصان ہوسکتا ہے۔لیکن اتحاد اگر جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

مولانا آزاد کے نظریہ حب الوطنی و متحدہ قومیت کا دوسرا اہم جز فرقہ وارانہ اتحاد تھا، جو جدو جہد آزادی میں تمام مذاہب کے افراد کی انڈین نیشنل کانگریس سے وسیع وابستگی اور جدو جہد آزادی میں شمولیت سے باہمی ہم آہنگی کی ایسی مثال پیش کرتی تھی جو کسی اور ملک کی آزادی کی تحریک میں نہیں ملتی۔خلافت تحریک نے بھی ملک کے عوام میں اتحاد پیدا کیا تھا اور یہ مولانا آزاد کی فکر کے عین مطابق تھا۔مولانا ملک کی تقسیم کو نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی نقصاندہ سمجھتے تھے۔ان کا یقین تھا کہ تقسیم سے مسائل حل نہیں ہوں گے بلکہ مسلمانوں کے لیے مسائل اور بڑھیں گے۔جو آج کی جذباتی سیاست سے سچ ثابت ہورہا ہے۔مولانا ہندو یا مسلمان، اکثریت یا اقلیت کے معنوں میں نہیں سوچتے تھے بلکہ وہ ایک ''مشترکہ یا مخلوط اکثریت'' کی بات کرتے تھے جو ہندو اور مسلمان نمائندوں پر مشتمل ہو۔اس تصور کے ذریعہ مولانا ایک سیکولر ماحول، ذہن اور سیاست کی بات کرتے تھے جس میں تمام مذاہب کے افراد کو مساوی اور یکساں مواقع ہوں۔یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد ملک کی تقسیم کو تو نہیں بچا سکے تاہم انہوں نے اپنے نظریات اور متحدہ قومیت یا ہندوستانی کے لیے بھرپور خراج یہی ہوگا کہ ان کے ان تصورات کو سماج میں پیش کرتے ہوئے ہم حسنِ سلوک، رواداری اور باہمی بھائی چارگی کی عملی مثال پیش کریں۔

عملی کاوشوں کے ذریعہ مابعد آزادی ہندوستان کے لیے سیکولر بنیادیں فراہم کیں اور سیاست کو مذہب سے الگ کرنے کی کوشش کی۔

مولانا آزاد کے نظریہ ہندوستانیت کا تیسرا پہلو عدم تشدد ہے۔انہوں نے ترجمان القرآن کے ذریعہ بین مذہبی اتحاد کو پیش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ تمام مذاہب کی بنیادی سچائیاں اور تصورات ایک ہیں۔جس کے نتیجہ میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان کسی تشدد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔انہوں نے انگریزوں کے خلاف تشدد کی وکالت نہیں کی بلکہ آزادی کے لیے عدم تشدد، عدم تعاون، صبر، تنظیم اور جذبہ قربانی کی وکالت کی۔انہوں نے عدم تشدد کو ایک پالیسی کے طور پر اختیار کیا۔ایک عقیدہ یا مسلک کے طور پر نہیں۔ان کے نزدیک جہاد کا مطلب ہتھیار اٹھانا یا جنگ کرنا نہیں بلکہ صبر و تحمل تھا۔

مولانا آزاد کے نظریات اور ہندوستانی عوام کے لیے متحدہ قومیت کا تصور آج بھی ہندوستان کی اہم ضرورت ہے۔مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے نظریہ میں پیش کرتے ہوئے ہم حسنِ سلوک، رواداری اور باہمی بھائی چارگی کی عملی مثال پیش کریں۔

ڈاکٹر عبدالقیوم، شعبۂ نظم و نسق عامہ میں اسوسی ایٹ پروفیسر ہیں

ڈاکٹر خالد مبشر الظفر

مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمہ کا کبھی پیشہ تو نہیں اپنایا لیکن انہوں نے ترجمہ کو اپنی ضرورت اور شوق کے طور پر ضرور اپنایا۔ مولانا آزاد اگر ترجمہ کی صنعت کی طرف واقعی سنجیدگی سے متوجہ ہوتے تو ان کی ہمہ پہلو شخصیت اور ہمہ لسانی صلاحیتوں کے نتیجے میں وہ اس میدان میں بھی زبردست مترجم ہی نہیں بلکہ ماہر ترجمہ کی حیثیت سے شاید اپنی شخصیت کو منوالیتے۔ مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری کے ضمن میں یہ بات ہمارے سامنے واضح رہنی چاہیے کہ یہاں بھی انہوں نے اپنے وہبی علم ہی کو کسبی معلومات پر فوقیت دی اور عربی زبان سے ترجمہ کی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ان کی ابتدائی کوششوں میں ترجمہ کے بعض اہم تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں جو بالکل ابتدائی عمر میں ہی انہوں نے انجام دیے تھے۔ وہ ابھی بچے ہی تھے کہ اپنے والد بزرگوار کے مرید مولوی حبیب الرحمٰن کی فرمائش پر جلال الدین سیوطی کے ایک مختصر رسالہ کا ترجمہ اردو میں کیا۔

مولانا آزاد کے ترجموں میں بنیادی کام ترجمان القرآن کی تیاری ہے۔ قرآن کریم کا یہ ترجمہ گو کہ نامکمل ہے لیکن نہایت سلیس، عام فہم، معنی خیز، مدلل اور زمینی حقائق سے قریب تر ہے۔ دراصل ترجمان القرآن کے ذریعہ مولانا اپنی فکر اور دین اسلام کی تعبیرات کو ملت اسلامیہ کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن اس میدان میں بھی ان کے لیے بے پناہ مسائل اور چیلنجز آتے رہے۔ اگر اطمینان بخش صورت حال اور پرامن ماحول میں یہ کام انجام دیا جاتا تو شاید ترجمہ اور تفسیر کے میدان میں ترجمان القران ایک شاہکار کے طور پر اپنا مقام بنالیتا۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ کام تکمیل پاسکا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ترجمان القرآن کی پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں اور اس کی دوسری جلد ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف کی اکتوبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ ۱۹۱۲ء سے شائقین کا اصرار تھا اور خود مولانا کی بھی خواہش تھی کہ وہ قرآن پاک کا ایک ترجمہ اور تفسیر لکھیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں سب سے پہلے میں نے ہی مولانا کے سامنے ترجمہ و تفسیر دونوں کے درمیان کی تفسیری ترجمہ کی تحریک کی۔ یعنی ایک ایسا مطلب خیز ترجمہ ہو جو گو سراسر لفظی نہ ہو لیکن لفظوں سے الگ بھی نہ ہو اور ساتھ میں حسبِ موقع توضیحی و تشریحی الفاظ بھی اس کے ساتھ ہوں۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن پیش کرنے کا مقصد یہ رکھا تھا کہ مطالب قرآنی کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے کہ اس میں کتب تفسیر کی تفصیلات تو نہ ہوں لیکن وہ سب کچھ جو قرآن کو سمجھنے کے لیے ٹھیک ٹھیک ضروری ہے موجود ہو۔ (ترجمان القرآن، جلد اول، ص ۱۷)۔ مولانا آزاد کی اردو نہ صرف فصاحت و بلاغت سے آراستہ رہتی تھی بلکہ معرب اور مفرس رہتی تھی لیکن ایسی زبان عام انسانوں کی سمجھ سے باہر ہوتی تھی اور اگر ترجمان القرآن میں اس طرح کی زبان استعمال کی جاتی تو اس کا عوامی فائدہ مفقود ہو کر رہ جاتا لہذا مولانا آزاد نے اس غرض سے کہ ترجمہ عوامی رہے 'الہلال' کی زبان کو تو بالکلیہ طور پر ترک کر دیا بلکہ ایسی زبان اختیار کی جس کی وجہ سے عوام اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ترجمہ کا سمجھنا ممکن ہو گیا۔ انہوں نے مختلف مقامات پر اپنے ترجمہ کی وضاحت کے لیے توضیحی نوٹ بھی دیے۔

مولانا آزاد کے ترجموں میں قرآن مجید کی آیات کے تراجم کے سلسلے میں بھی دو طرح کے طرز پائے جاتے ہیں ایک تو وہ طرز ہے جو انہوں نے ترجمان القرآن میں استعمال کیا ہے جس میں زبان عام طور پر سادہ اور سلیس رکھی گئی ہے دوسرا وہ طرز ہے جو انہوں نے اپنے علمی مقالات کے دوران قرآنی آیات کے تراجم کے سلسلے میں اختیار کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے مضمون کی نوعیت اور قارئین کے معیار کے بلحاظ اپنی زبان کے معیار میں کمی و بیشی کی ہے۔

ان کی سورہ فاتحہ کی تفسیر نے بڑا غیر معمولی اثر ڈالا اور علمی حلقے میں بھی ہلچل پیدا ہوئی۔ دو طرح کے ردعمل سامنے آئے حوصلہ افزائی اور شدید تنقید کا۔ مولانا نے اپنے ترجمہ میں ایک نئے اسلوب کی بنا ڈالی جو عام روایات سے ہٹ کر تھا۔ اس میں لفظی ترجمے اور محاوراتی ترجمہ سے بھی آگے مفہوم کی ترسیل اور متن کو قابل فہم بنانے کی مترجم کی مخلصانہ مداخلتیں موجود ہیں۔ جدید دور میں مداخلت یا انٹرویشن پر کافی کام ہو رہا ہے اور ترجمہ سے متعلق ابھرتے ہوئے میدانوں میں اس کی اہمیت و افادیت پر مختلف نکات نظر سامنے آرہے ہیں۔ خاص طور پر مذہبی اور صحافتی تراجم میں مداخلتوں کے متنوع اور الگ الگ انداز کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے اس لیے کہ مذہبی تراجم میں مداخلتیں بعض اوقات مذہبی جذبات کو شدید مجروح کرتی ہیں تو وہیں صحافتی تراجم میں اس طرح کی مداخلتیں بعض وقت سیاسی مسائل بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ مولانا آزاد نے ابتدا ہی سے ان خدشات کو محسوس کر لیا تھا اور انہوں نے مداخلت کا وہ طرز

اپنایا جو قارئین کو کم سے کم الجھن میں مبتلا کر سکے۔ مولانا آزاد نے اپنے ترجمے میں پرکشش سلاست اور تسلسل بیانی کا خوب خیال رکھا اور جن مقامات پر انہوں نے اپنی مداخلت کو ضروری محسوس کیا وہاں قوسین کو استعمال کیا۔ قوسین میں اپنی اضافی توضیحات اور تفصیل کا یہ نیا طرز اپنے آپ میں ایک جدت بن گیا تھا اور مولانا آزاد کے بعد اس طرح کے ترجموں کا ایک طویل سلسلہ ہمیں ملتا ہے جن میں' مولانا مودودی اور امین احسن اصلاحی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ بعض ناقدین کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر مولانا آزاد کو اپنے کام کی تکمیل کا موقع ملتا اور اس پر وہ نظر ثانی بھی کر لیتے تو شاید مزید نکھرے ہوئے موتی ہمارے سامنے آتے لیکن بعد میں مولانا آزاد کے متبعین نے اس صنف کو کافی ترقی دی۔

برجستگی اور چست فقروں کے استعمال میں مولانا آزاد کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا ہے اور زبان کی اس کیفیت نے ترجمہ کو بھی اصل زبان کی طرح پرکشش بنا دیا تھا۔ ترجموں میں عربی اور فارسی زدہ زبان کا الزام مولانا آزاد پر بھی آیا ہے اور صرف عوام ہی نہیں بلکہ بعض خواص نے بھی لکھا ہے کہ اس طرح کے طرز تحریر نے زبان کی چاشنی کو متاثر بھی کیا ہے اور بول چال کی زبان میں تصنع بھی در آیا ہے۔ لیکن حقیقی صورتحال ایسی نہیں ہے مولانا پر صرف عربی یا فارسی کا ہی اثر نہیں تھا بلکہ ہندوی یا ہندوستانی زبان کے الفاظ وفقروں کا بھی مولانا نے جا بجا استعمال کیا ہے۔ اس بات کا اعتراف ڈاکٹر عبدالمغنی نے یوں کیا ہے:" مولانا کے اسلوب کے خلاف یہ شکایت عام طور پر، خاص طور پر بھی، پڑھنے اور سننے میں آتی ہے کہ انھوں نے علمی وادبی زبان کو محاورے اور بول چال سے جدا کر دیا اور اس طرح زبان کا رشتۂ حیات کاٹ کر اسے مقدس حد تک مصنوعی بنا دیا۔ لیکن جہاں تک میں نے آزاد صاحب کے اسلوب کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے مجھے ایسی کوئی تقدیس اس کے اندر نظر نہیں آتی۔ ان کا اسلوب اس لحاظ سے بہت علمی ہے کہ موقع ومقام کے اعتبار سے جہاں انھوں نے فارسی وعربی الفاظ وتراکیب استعمال یا اختراع کی ہیں بسا اوقات ٹھیٹ ہندوستانی لفظوں اور فقروں سے بھی دریغ نہیں کیا ہے، بلکہ اکثر بڑے خوبصورت اور سڈول لفظ وضع کیے ہیں۔ بعض تازہ احساسات کی ترجمانی کے لیے سبک اور سجل فقرے ایجاد کیے ہیں۔ اپنی محبوب چائے وہائٹ جسمین (White Jasmine) کا ترجمہ انھوں نے ''گوری چمبیلی'' کیا، حالانکہ یاسمین سفید یا یاسمین ابیض بھی کر سکتے ہیں۔'' (حوالہ: ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش، ڈاکٹر عبدالمغنی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص:128)

مولانا آزاد کی جانب سے اختراع کردہ ترجمہ کی نئی جدت واختراع ترجمہ کی مداخلت حوصلہ مند تو تھی ہی لیکن احتیاط اور سنجیدگی ومتانت کے ساتھ انجام دیا گیا ایک شعوری عمل بھی تھا۔ اپنے اس طرز نگارش کے لئے آزاد نے اپنے پیش رو علماء سے بھی مکمل استفادہ کیا تھا۔ ''مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان میں شبلی کا انداز تحریر نمایاں ہے اس کی حرکیت ایک منطق کے پیچ وخم کھولتی ہے اس کی خطابت متانت سے خالی نہیں۔ اس میں شوکت کے ساتھ ساتھ صلابت ہے۔ انشا پرداز نے بڑی صراحت اور نفاست کے ساتھ اپنے مدعا کا اظہار کیا ہے۔ چند سطروں میں ایک اہم حقیقت نہایت معقول طریقے سے واضح کی گئی ہے۔ یہ ایک حکیمانہ تبلیغ ہے، جس میں بحث کے خاص نکات کا ابلاغ پورے زور سے، مؤثر طور پر ہوا ہے۔ الفاظ کے آہنگ میں اعتماد کی کیفیت سے استناد کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ (حوالہ: ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش، ڈاکٹر عبدالمغنی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ص:65)

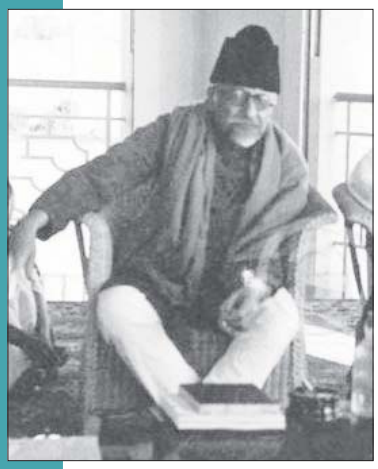

اپنی بات کو مناسب انداز سے قاری تک پہنچانے اور اس میں چاشنی پیدا کرنے اور تحریر میں تقرر کا لطف پیدا کرنے کے لیے ابوالکلام آزاد نے ''ترجمان القرآن'' میں قوسین کے طریقہ کو اپنایا جس سے آزاد کا مقصد بھی حاصل ہو گیا اور کسی کو ترجمہ پر اعتراض کرنے کی خاص گنجائش بھی فراہم نہیں ہو سکی۔

مولانا آزاد نے ترجمے کے میدان میں جو تجربات کیے ہیں گو کہ وہ دینی نقطہ نظر کے تراجم تک محدود ہیں لیکن مولانا کا ترجمے کا ویژن بہت واضح تھا کہ اردو کو محض ادبی زبان کے بجائے علم وسائنس سے ہم آہنگ کیا جائے اس ضمن میں وہ کسی حد تک غیر ضروری شدت پسندی کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔ مولانا نے لسان الصدق میں ان جذبات کو اس طرح ظاہر کیا ہے: ''پس ہم اگر اردو کو ایک علمی زبان بنانا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض یہ ہے کہ یورپ کی علمی زبانوں کا سرمایہ ترجمہ کر کے اردو میں جمع کر دیں۔ ورنہ اس ضرورت سے صرف نظر کر کے شیکسپیئر کے ڈراموں اور رینالڈ کے ناولوں کا ترجمہ کرنا دنیا کو اپنی جہالت پر خود ہنسوانا ہے۔'' (لسان الصدق، اگست، ستمبر 1904)

ڈاکٹر خالد مبشر الظفر شعبۂ ترجمہ کے صدر ہیں۔

مولانا آزاد کا اسلوب: غبار خاطر کی روشنی میں

ڈاکٹر فیروز عالم

مولانا ابوالکلام آزاد ایک عظیم مجاہد آزادی، قومی رہنما، مذہبی عالم، صحافی اور دانشور ہی نہیں ایک صاحب طرز انشا پرداز بھی تھے۔ لسان الصدق، الہلال اور البلاغ کے اداریوں اور مضامین اور تذکرہ، قول فیصل، ترجمان القرآن اور غبار خاطر وغیرہ تصانیف میں مولانا نے اپنی طرز بیان کا جو جادو جگایا ہے اس کا معترف ایک زمانہ ہے۔ خاص طور سے غبار خاطر مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کا سب سے عمدہ نمونہ ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک مجموعہ مکاتیب ہے لیکن اس میں مولانا آزاد کی شخصیت کے بہت سے مخفی گوشوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے اور ان کی پسند و ناپسند کا بھی پتہ چلتا ہے۔ غبار خاطر کی نثر انھیں اردو کے صاحب طرز ادیبوں کی صف میں اعلیٰ مقام عطا کرتی ہے۔ انھوں نے غبار خاطر کی نثر میں روانی، بے ساختگی اور فصاحت و بلاغت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ صنایع و بدائع کا بھی بہترین استعمال کیا ہے۔ تشبیہات و استعارات اور تلمیحات و کنایات کے ساتھ ساتھ وہ محاورات وضرب الامثال کا بھی ہنرمندانہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ دوسری زبانوں کے فکر انگیز الفاظ ومحاورات سے بھی خاطر خواہ کام لیتے ہیں۔ وہ پرانی تراکیب کو بھی نئی تراش خراش کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مولانا نے اپنے نفیس خیالات اور دلکش واقعات کا اظہار بے حد دلنشین پیرائے میں کیا ہے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نثر میں شاعری کر رہے ہیں۔ موقع ومحل کے اعتبار سے وہ اردو، فارسی اور عربی کے اشعار بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر کی ایک اہم خوبی استدلالی اور وضاحتی طریقے کا استعمال ہے۔ ان کی ہر بات کا ایک منطقی جواز ہوتا ہے اور اس کی وضاحت کے لیے وہ اس کی تمام جزئیات پر نظر رکھتے ہیں۔ غبار خاطر کی نثر میں مولانا کے ابتدائی دور کی تحریروں کی بہ نسبت سلیس اور صاف ستھرا عام فہم انداز ملتا ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ وتراکیب اور اصطلاحات کا استعمال اس میں بھی ملتا ہے لیکن نوعیت بدلی ہوئی ہے، اس میں غرابت اور ثقالت نہیں پیدا ہوتی۔ مولانا آزاد نے غبار خاطر میں ادبی اور لسانی اعتبار سے جس جدت اور انفرادیت کا ثبوت دیا ہے وہ انھیں ایک اعلیٰ درجے کے ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز کے منصب پر فائز کرتا ہے۔

غبار خاطر تک آتے آتے مولانا کی نثر ڈھل ڈھلا کر نکھر گئی تھی۔ اس میں ناہمواری، ثقالت اور تکرار نام کو نہیں ہے۔ عربی، فارسی کے مشکل اور پیچیدہ جملوں اور تراکیب سے بھی حتی الامکان اجتناب کرنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ شائد یہ ہے کہ غبار خاطر کے یہ مکاتیب 15/اگست 1942 سے مئی 1943 کے درمیان لکھے گئے، جب مولانا 'انگریزو ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کے نتیجے میں قلعہ احمد نگر جیل میں بند تھے۔ جیل میں وہ ترجمان القرآن جیسا کوئی علمی کام کر نہیں سکتے تھے، ایسے میں انھوں نے اپنے مختلف خیالات واحساسات کو صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے نام مکتوب کی صورت میں ڈھال دیا، مولانا جانتے تھے کہ یہ خطوط شیروانی صاحب تک نہیں پہنچ سکتے کیوں کہ ڈاک پر پابندی تھی لیکن انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ان مکاتیب میں مولانا بہت حد تک کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے خاندان، تعلیم، عادات، نفسیات، کردار اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ مکاتیب عمر کی اس منزل میں لکھے گئے جب وہ پختگی کو پہنچ چکے تھے۔ اب ان کی ذات اظہار چاہتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مختلف اور متنوع موضوعات پر وہ جو کچھ سوچتے اور محسوس کرتے ہیں، دوسرے بھی ان سے واقف ہوں۔ چنانچہ ترسیلی پیرایہ اختیار کرتے ہوئے انھوں نے عام فہم زبان استعمال کی۔

زبان و بیان کے اعتبار سے غبار خاطر مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کی نثر رواں، سبک اور بالکل نپی تلی ہے۔ شگفتگی اور جاذبیت اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ غبار خاطر میں مولانا نے متنوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اپنی پسند و ناپسند، خاندان اور دیگر نجی تفصیلات کے علاوہ انھوں نے خدا کی ہستی سے متعلق گفتگو کی ہے، ایک خط میں انانیت پر لکھا ہے۔ جیل کی زندگی، وہاں کے لوگوں کی زندگی کے شب و روز پر لکھا ہے۔ بعض خطوط میں حکایت زاغ و بلبل اور چڑیا چڑے کی کہانی پیش کی ہے اور بعض میں اپنی چائے نوشی کے شوق پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔

حکایت زاغ و بلبل (خط نمبر 18) اور چڑیا چڑے کی کہانی (خط نمبر 20-19) میں انھوں نے اپنے گہرے مشاہدے، باریک بینی، گرد و پیش کے ماحول اور اشیا سے دلچسپی اور ان سے متعلق تفصیلات بہم پہنچانے کے شوق کا ثبوت دیا ہے۔ 45 صفحات کو محیط ان خطوط میں مولانا آزاد نے چھوٹی چھوٹی جزئیات سے بڑی خوبی سے واقف کرایا ہے۔ مثال کے طور پر چڑیا چڑے کی کہانی سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''گوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے

چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھے گی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اٹھائے گی اور چہرے پر تفحص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا، اور ہو کیا رہا ہے؟'' (غبار خاطر ص 215)

غبار خاطر کے بعض مکاتیب میں منظر نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ خیال پہلے ادیب کے اندرون میں الفاظ کی معنویت کے ساتھ مل کر ایک سماں پیدا کرتا ہے، پھر خود الفاظ اس سماں کو تجسیم کے عمل سے خارجی دنیا میں پیش کرتے ہیں۔ خط نمبر 24 کا ایک اقتباس پیش ہے:

''رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی ہوئی چاندنی، اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات، چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔ نیچے جمنا کی رو پہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے، اور ہوائی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے'' (ص 259)

مولانا آزاد کے اسلوب تحریر کی ایک اہم خوبی تصویریت اور موسیقیت بھی ہے۔ وہ جب کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو گویا اس کی زندہ تصویر نگاہوں میں کھنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ رواں اور سبک الفاظ کا حسن استعمال نغمگی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ قاری اس تصویریت اور نغمگی کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ کیفیت بے اختیار پیدا ہوتی ہے، اس میں کسی تصنع یا تکلف کا کوئی دخل نہیں۔

غبار خاطر میں تخلیقی نثر کے نمونے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں۔

''جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز مزے چکھے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و عشرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔''

(مکتوب مورخہ۔ 27 اگست 1942، ص 69)

غبار خاطر کے اسلوب کی ایک اہم خصوصیت انانیت ہے۔ لیکن یہ انانیت خود پرستی نہیں، خود اعتمادی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عام روشنی سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے اور عام سوچ سے ان کی سوچ بالکل الگ تھی۔ مولانا آزاد کے اسلوب کی ہمواری و استواری اور وضاحت و صراحت میں ان کی مخصوص انانیت اور جمال پسندی کا بھی حصہ ہے۔ چونکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بات نہ صرف لوگوں تک پہنچے بلکہ وہ اسے بخوبی سمجھ سکیں اس لیے انھوں نے پوری صراحت سے کام لیا۔ ان کی فطری حسن پسندی کو یہ گوارا نہیں ہو سکتا تھا کہ زندگی کی طرح ان کی تحریر میں بھی کوئی خامی یا بدسلیقگی پیدا ہو، اس لیے وہ ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔

'غبار خاطر' کی زبان سادہ ہے مگر اس سادگی میں مولانا نے صنعت کاری کا پورا اہتمام کیا ہے۔ خیال پسندی، استعارہ سازی، تلازمات خیال اور اشعار کی مدد سے وہ معنوی تہیں تخلیق کرتے چلے جاتے ہیں۔ زبان میں کسی قسم کا سقم یا الجھاؤ نہیں ہے۔ روزمرہ اور محاورے کا فطری حسن اسے آبشار کی سی روانی عطا کرتا ہے۔ عبارت کی روانی میں کوئی لفظ یا فقرہ حائل نہیں ہوتا لیکن سطح کے نیچے جذبات اور افکار کی دنیائیں پنہاں ہوتی ہیں۔

'غبار خاطر' دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کا نقطۂ عروج ہے۔ جس نثر میں کبھی خطیبانہ انداز ہوا کرتا تھا وہ اب خود کلامی اور خود کلامی کی شکل میں ہم کلامی کی سرگوشیوں سے آشنا ہوئی۔ ان کے اسلوب میں شاعر کا تخیل اور مصور کا فن باہم آمیز ہو گئے۔ سچائی یہ ہے کہ وہ انداز جس میں فارسی کی چاشنی، کلاسیکی صنعت گری اور بیسویں صدی کے اوائل کا رومانی مزاج سب مل کر تحلیل ہو گئے تھے، وہ مولانا آزاد پر ختم ہو گیا۔ کیوں کہ ان جیسا ادیب جس کے یہاں یہ تمام عناصر ایک ساتھ جمع ہو جائیں اب شاید اردو میں نہیں آئے گا۔

ڈاکٹر فیروز عالم، مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں

مولانا آزاد کا تصورِ قومیت وثقافت

ڈاکٹر ارشاد احمد

مولانا آزاد کی ہندوستانی قوم کے لیے سب سے بڑی خدمت ہندوستانی قومیت کا واضح تصور عطا کرنا ہے۔ ہندوستان کی قومی تحریکِ آزادی اور ایک ترقی پذیر ہندوستانی قوم کے لیے جو تہذیبی اور سیاسی انتشار کا شکار تھی' آزاد کے نظریۂ قومیت نے قطب نما کا کام کیا۔ ان کی فکر کے دو مخصوص میدان تھے' مذہب اور سیاست' جن کا نتیجہ فکر نظریۂ قومیت ہے۔ آزاد کے فکر وعمل میں یہ تصور تسلسل سے نظر آتا ہے۔ 1903ء سے 1958ء کی طویل قومی زندگی میں مولانا آزاد اپنی تحریر وتقریر میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے رہے اور اسے ایک واضح شکل اور معین سمت دیتے رہے۔ بالآخر مشترکہ کلچر کی بنیاد پر استوار متحدہ قومیت کے تصور کو نہایت واضح اور جامع طور پر 1940ء کے تاریخ ساز خطبۂ صدارت میں پیش کیا' جب وہ انڈین نیشنل کانگریس کے دوسری مرتبہ صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ ''ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم بن چکے ہیں''۔ مولانا آزاد نے اس خطبے میں برطانوی حکومت کے پیدا کردہ مسئلۂ دو قومی نظریۂ کا مدلل جواب دیا ہے۔ یہ نظریہ اس مفروضے پر قائم کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب بنیادی طور پر مختلف ہے اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس مفروضے کا جواب مولانا آزاد نے یہ کہہ کر دیا کہ ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔'' گاندھی جی نے بھی متحدہ قومیت کے مسئلے پر مولانا آزاد کے انداز میں یہ کہا کہ ''میں گجراتی ہوں اور گجراتی ہونے کا فخر ہے، لیکن میں ہندستانی بھی ہوں۔'' مولانا آزاد کا یہ خطبہ گویا ہندوستانی قومیت کے مینی فیسٹو کی حیثیت رکھتا ہے۔ تحریکِ آزادی کے دیگر قومی رہنما' قومی کلچر اور نیشنلزم کے سنجیدہ مسئلہ پر کوئی معقول' مربوط اور قطعی نظریہ پیش نہیں کر سکے لہٰذا مولانا آزاد کا موقف ہی کانگریس اور آزاد ہندوستان میں قابل قبول ہوا۔ اس فرقہ وارانہ سیاسی ہیجان کے زمانے میں قومی کلچر اور نیشنلزم کے سنجیدہ مسئلے پر غور کرنے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔ سید عابد حسین کے مطابق ''اس کی فرصت کسی کو نہ تھی کہ تہذیبی مسائل کے بارے میں تعمیری نقطۂ نظر سے غور کرے۔''

مولانا آزاد کے تصور قومیت کی عملی تعبیر تب سامنے آئی جب انھوں نے 1946ء میں کیبنٹ مشن کے سامنے بطور کانگریس صدر، ہندوستان کو انڈین فیڈریشن کے نام پر متحد رکھنے کے لیے ایک معقول حل پیش کیا جسے ہندو مہاسبھا' مسلم لیگ اور کانگریس سمیت سبھی فریقوں نے تسلیم کرلیا۔ گاندھی جی نے اس حل کو 'قومیت کے احساس کا ترجمان' قرار دیا۔ مولانا آزاد ہندوستان کو ایک قوم اور ایک تہذیب تصور کرتے تھے۔ کلچر اور قومیت کی وحدت کے معنی ان کے نزدیک مشترکہ کلچر، متحدہ قومیت اور مشترکہ مفاد تھا۔ اسی نظریے کی تبلیغ وہ تحریک آزادی کے دوران اپنی تحریر وتقریر میں کرتے رہے۔ انھوں نے سب کچھ برداشت کیا لیکن اس نظریے سے، جس پر وہ چٹان کی طرح تمام عمر ثابت قدم رہے، کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ مولانا آزاد اور کانگریس کے دیگر قومی رہنما تہذیبی اور سیاسی دونوں قسم کی تقسیم کے خلاف ساتھ لڑتے رہے لیکن تقسیم ہند کے وقت مولانا آزاد اپنی لڑائی میں تنہا کھڑے رہے۔ مولانا آزاد نے مادر وطن کی آزادی کے لیے بے انتہا قربانیاں دی تھیں لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے نہیں کیونکہ متحدہ قومیت کے سب سے بڑے علمبردار مہاتما گاندھی نے مجبور ہوکر تقسیم کو تسلیم کرلیا تھا۔ مولانا آزاد گاندھی جی کو اپنے تصور قومیت کی جیتی جاگتی مثال مانتے تھے، جن کی رہنمائی میں انھوں نے اپنے ہم مذہب اور ہم وطن عوام کے ساتھ آزادی کی جنگ انگریزی سامراج کے خلاف لڑی تھی۔ بہرحال مولانا آزاد نے بھی اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے سیاسی تقسیم کو قبول کرلیا لیکن کلچر کی تقسیم کی تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اس طرح انھوں نے مشترکہ قومی کلچر کو متحدہ ہندوستان اور اس کی آزادی پر ترجیح دی۔ مولانا نے اپنے نظریے کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ ''قوم ایک ہے اور اس کی ثقافتی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی۔ ہم سیاسی سطح پر ناکام رہے اور اسی لیے ہم ملک کو تقسیم کررہے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے اس یقین کو قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری ثقافت کا بٹوارا نہیں کیا جائے گا۔'' مولانا آزاد نے اس سیاسی تقسیم کو بھی ظاہری قرار دیا نہ کہ حقیقی معنوں میں۔ انہوں نے اس تقسیم مثال کچھ یوں دی کہ ''اگر پانی میں ہم ایک چھڑی رکھ دیں تو بظاہر ایسا لگے گا کہ پانی بٹ گیا ہے لیکن پانی تو جوں کا توں رہتا ہے اور جیسے چھڑی ہٹائی جاتی ہے تو ظاہری تقسیم بھی ختم ہوجاتی ہے۔''

مولانا آزاد نے بحیثیت وزیر تعلیم تقسیم کے بعد اکتوبر 1947ء کے ایک خط میں ہندو پاک کے درمیان ایجوکیشنل اور کلچرل ریلیشنز کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا: ''ہندوستان کی تقسیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ دونوں ریاستوں کے تعلیمی وثقافتی روابط میں انقسام وتحدید کے الگ الگ دائرے بن جائیں۔ آج جب ہم تمام اقوام عالم کو ایک دوسرے سے قریب تر اور مربوط دیکھنا چاہتے ہیں تو اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ خود اپنے ملک کے اندر ایک دوسرے سے منقطع ہوجائیں۔'' مولانا کا یہ خیال دلچسپ ہے کیوں کہ وہ کلچرل ریلیشنز کے حوالے سے ہندو پاک کو 'اپنے ملک کے اندر دو ریاست' قرار دے رہے ہیں۔ ہندوستانی کلچر کے متعلق مولانا آزاد کا تصور بالکل جدید ہے اور ثقافتی تکثیریت (Cultural Pluralisim) کے تصور پر مبنی ہے۔ جنوری 1951ء میں انھوں نے ہندوستانی کلچر

کے بارے میں کہا کہ ''ہندوستان میں ہمیشہ ایک ہی ثقافت رہی ہے، ہندوستانی ثقافت، جو زمانۂ قدیم، قرونِ وسطیٰ اور عصرِ جدید کے رجحانات کا مجموعہ ہے۔''

1903ء میں آزاد نے اپنا اخبار ''لسان الصدق'' نکالا۔ اس کے پہلے ہی شمارے میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ہندوؤں سے معاشرتی اشتراک کے نتیجے میں عربی اور ایرانی رنگ کی جگہ ایک خاص ہندوستانی مخلوط رنگ پیدا ہونے کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ 1905ء میں برطانوی حکومت نے بنگال کا بٹوارا ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاقوں کو علیحدہ کرنے کے مقصد سے کیا۔ اس سے ہندو سخت ناراض ہوئے اور انھوں نے حکومت کے خلاف انقلابی جدوجہد شروع کردی۔ مولانا آزاد نے انقلابی رہنماؤں شیام سندر چکرورتی اور ارابندو گھوش سے ملاقاتیں کیں اور انقلابی گروپ میں شامل ہوگئے۔ ہندو انقلابی، مسلمانوں کو برطانوی حکومت کا دوست اور ہندوستانی آزادی کے حصول میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ آزاد نے انقلابیوں کو ہندوستانی مسلمانوں کے برخلاف ایران، مصر اور ترکی کے مسلمانوں کی جمہوریت پسندی اور حصولِ آزادی کی انقلابی جدوجہد سے واقف کرایا۔ 1908ء میں آزاد عراق، شام، مصر، ترکی اور فرانس کی سیاحت پر گئے۔ اس سفر میں وہ ایرانی انقلابیوں، مصطفےٰ کمال پاشا کے پیروؤں اور ینگ ترک تحریک کے رہنماؤں سے ملے۔ آزاد مسلم ممالک میں سامراج مخالف جمہوریت پسند جدوجہد آزادی سے بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان واپس آکر ہندوستانی مسلمانوں کو قومی جدوجہد آزادی کی قیادت کے لیے تیار کرنے کا مشن اپنے ذمہ لیا۔ اس مشن کے تحت آزاد نے 1912ء میں الہلال اخبار کی اشاعت شروع کی۔ الہلال نے اپنے قارئین میں قومیت کے انقلابی خیالات سے ہلچل پیدا کردی۔ آزاد کا مقصد پورا ہوا اور تین سال سے کم مدت میں ہی ہندوستانی مسلمانوں میں قومیت کی روح بیدار ہوگئی۔ الہلال میں متعدد سیاسی اور ثقافتی موضوعات پر اپنے خیالات سے آزاد نے قارئین میں قومیت کا شعور پیدا کیا۔ اس کی پاداش میں حکومت نے انھیں شہر بدر کرکے چار سال کے لیے رانچی میں نظر بند کردیا۔ 1920ء میں رہا ہونے کے دو ہفتوں بعد ہی گاندھی جی اور تلک کے ساتھ ایک میٹنگ میں خلافت تحریک اور سوراج کی تحریک کو مشترکہ پروگرام کے بطور چلانے کا فیصلہ لیا۔ 1923ء میں وہ کانگریس کے صدر چنے گئے۔

مولانا آزاد الہلال کی اشاعت کو ہندوستان کی قومی سیاست کے لیے بہت اہم مانتے تھے اور بارہا اپنی تحریر و تقریر میں اس کا حوالہ دیتے تھے۔ 1922ء میں کلکتہ کے مجسٹریٹ کو انھوں نے ایک تحریری بیان دیا جس میں خلافت اور سوراج کی متحدہ قومی تحریک کو الہلال کی اشاعت کا نتیجہ بتایا۔ مولانا آزاد خلافت کی تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ متحد کرکے ایک قومی جذبے سے تحریک آزادی کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کے لیے یہ صرف ہندوستان میں برطانوی سامراج سے حصول آزادی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ وہ برطانوی سامراج کے غلام ایشیا اور مشرقی ممالک خصوصاً مسلم ممالک کو بھی ہندوستان کے اس ہندو مسلم اتحاد و اشتراک کی قوت سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد اس اتحاد کو مستحکم، وسیع تر اور دائمی بنانا چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ دیگر تمام قومی رہنماؤں میں اتحاد کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس اتحاد کے لیے سوراج کے مطالبے سے دستبردار ہونے کو تیار تھے۔ انھوں نے 1857ء کی جنگ آزادی کے طرز پر مسلمانوں خصوصاً علما کو تحریکِ آزادی کی قیادت کرنے اور اپنے ہندو ہم وطنوں کے ساتھ برطانوی سامراج کے خلاف متحد ہوکر تحریک چلانے کے لیے اپنی ہر تحریر و تقریر میں ترغیب دیتے رہے۔ مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کو ایک نیشن سے تعبیر کرتے ہوئے متحدہ قومیت کے نظریے کا جواز میثاق مدینہ سے فراہم کیا کہ ''اگر رسول خدا مٹھی بھر قریش مکہ کے مقابلے میں اطرافِ مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کرسکتے تھے تو آج اس عظیم الشان قوت کے غرور، گھمنڈ، خونخواری کے مقابلے میں جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہوجائیں۔'' مولانا آزاد نے خلافت تحریک کو تحریک آزادی قرار دیا لہٰذا ترکی میں خلافت کے خاتمے سے ان کے وسیع تر پروگرام میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ ہنوز ہندوستان کی آزادی کے لیے سرگرم رہے۔ ان کے پروگرام کی کامیابی کا انحصار مشترکہ قومی کلچر اور نیشنلزم کی ٹھوس بنیاد پر قائم ایک آزاد، جمہوری اور متحد ہندوستان کے تصور پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک کی سیاسی تقسیم کے باوجود مشترکہ کلچر کی بنیاد پر وسیع تر ہندو مسلم اتحاد کا سپنا سنجوئے رہے۔ یہی وہ پروگرام تھا جس کی طرف انھوں نے 1954ء کی پارلیمانی تقریر میں اشارہ کیا تھا کہ ''میں نے 40 سال پہلے اپنی زندگی کا پروگرام ملک کی خدمت کا بنایا تھا۔ یہ بات میں کہہ رہا ہوں 1907ء کی جب میری عمر اٹھارہ انیس برس سے زیادہ نہ تھی اور جب میں بنگال کی ریوالیوشنری پارٹی میں شریک ہوا تھا۔'' جواہر لال نہرو نے آزاد کے اسی پروگرام کے بارے میں کہا ہے کہ ''وہ بھارت کی آزادی سے امپیریل طاقتوں سے مسلم ممالک کو بچانا چاہتے تھے۔''

تحریک آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر معروف تاریخ داں پروفیسر بپن چندرا نے اپنے خطبے میں کہا تھا کہ ''آزادی کے لیے جدوجہد کرنے اور آزادی حاصل کرنے کے علاوہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی سب سے بڑی دین وہ خواب تھا جس نے جنگ آزادی کی ترغیب دی اور جس نے ایسے لوگوں کی ایک وراثت عطا کی جنہیں 1947ء کے بعد ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کرنا تھی۔۔۔ جدوجہد آزادی کا ایک خواب مضبوط اور متحد ہندوستان کا خواب تھا۔'' مولانا آزاد نے بھی سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے متحد ہندوستان کا خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر کے لیے وہ تادم آخر کوشاں رہے۔ آج مولانا آزاد کے مشترکہ کلچر اور نیشنلزم کے بامعنی تصورات کی اہمیت اور افادیت دو چند ہوگئی ہے، نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ نو سامراجیت کی شکار دنیا کے لیے بھی۔

ڈاکٹر ارشاد احمد، نظامت فاصلاتی تعلیم میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

لسان الصدق کا نوجوان انقلابی صحافی

ڈاکٹر محمد فریاد

پندرہ سولہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ یہ عمر تو لڑکپن میں شمار ہوتی ہے جب لوگ خوب ہنسی ٹھٹھا کرتے ہیں اور بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن اس لڑکپن میں نوجوان آزاد پوری طرح سے علامہ اقبال کے اس شعر کا ترجمان تھے کہ:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اسکو اپنی منزل آسمانوں میں

جواں سالہ مولانا آزاد کا یہ تاثر تھا کہ انسانی سوسائٹی میں کسی بھی انسان کو بلند مقام تب حاصل ہوسکتا ہے جب اس کے مضامین اخبارات ورسائل میں شائع ہوں اور اس سے بھی بلند مرتبہ تب حاصل ہوسکتا ہے وہ کسی اخبار یا رسالہ کا ایڈیٹر ہو۔ یہی وہ سوچ تھی یہی وہ فکر تھی جو مولانا آزاد کو صحافت کے میدان میں کھینچ لائی اور اردو صحافت بھی نئی فکر نئی روش سے آشنا ہوئی۔ نومبر 1903 میں ابوالکلام آزاد محی الدین آزاد کیلئے وہ اہم مہینہ ثابت ہوا جس میں انہوں نے اپنے صحافی بننے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ماہنامہ ''لسان الصدق'' جاری کرکے پوری کی، جس کا پہلا شمارہ 20 نومبر 1903 کو ہادی پریس روڈ کلکتہ سے شائع ہوا۔

لسان الصدق کی عمر اگرچہ زیادہ نہیں رہی۔ نومبر 1903 میں اس کی اشاعت کی ابتداء ہوئی اور 1905 میں کل تیرہ شمارے کے ساتھ ہمیشہ کیلئے بند ہوگیا۔ لیکن اس مختصر مدت میں اس ماہنامہ نے اپنے مقصد اور نصب العین کے مطابق صحافت کی۔ لسان الصدق کی صحافت مولانا آزاد کی صحافتی زندگی بھی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے ساتھ ہی ان کے بامقصد صحافت کی ابتداء ہوتی ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز ہری ہردت رائے کے جامِ جہاں نماں کی اشاعت سے 1822 میں ہو چکا تھا 1857 کے غدر کا محرک اردو صحافت کو ہی ٹھہرایا گیا۔ اور دہلی اردو اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر کی شہادت کے ذریعہ پہلا شہید صحافی کا سہرا بھی اردو صحافت کے سر بندھا۔ لیکن غدر کے بعد مقامی زبان کی صحافت اور بالخصوص اردو صحافت پر انگریز حکومت کا عتاب نازل ہوا جس سے اردو صحافت کا مزاج حریفانہ سے خوشامد پسندانہ ہوگیا تھا۔ جس سے اول اول حسرت موہانی اور ظفر علی خان نے انحراف کیا اور پھر مولانا آزاد کی آمد نے اسی باغیانہ روش کو اختیار کیا جو اس کے خمیر میں تھی اور اردو صحافت ایک بار پھر سے تجدید احیائے ملت اور آزادی ملک وقوم کی روش پر گامزن ہوگئی۔

لسان الصدق کے صفحات پر انہوں نے مسلمانوں کے معاشرتی رسوم ورواج پر جہاں کھل کر لکھا، وہیں علمی تراجم پر بھی کام کیا۔ اس اخبار میں مولانا آزاد نے خود تو لکھا ہی دوسرے معتبر قلم کاروں کو بھی اس کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھنے کی دعوت دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس اخبار نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی اور ملک کے مشہور اخبارات نے اس کے علمی ادبی مذاق کو سراہا۔ جیسا کہ ابوسلمان شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں۔

''ملک کے مشہور جرائد واخبارات مثلاً وکیل امرتسر پیسہ اخبار لاہور، مخزن لاہور، افسانہ حیدرآباد دکن، معین الاخبار مرادآباد، ریاض الاخبار گورکھ پور، دلچسپ امرتسر، ایڈورڈ گزٹ شاہ جہاں پور، نظام الملک مرادآباد نے اسکے معیار، علم وصحافت، مضامین کے تنوع فکر کی نکتہ آفرینی مباحث کی جدت طرازی ترتیب وتہذیب کے حسن اسلوب کی شگفتگی، انشاء کی دلربائی، ندرت قلم کی پختگی اور مقاصد کی اہمیت پر داد تحسین کے پھول برسائے۔''

سب سے پہلے شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن نے لسان الصدق کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''ابوالکلام محی الدین صاحب آزاد دہلوی نے جو عرصہ سے کلکتہ میں مقیم ہیں لسان الصدق نام کا ایک ماہوار رسالہ نکال کر ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے اور وہ کمی یہ تھی کہ دارالسلطنت ہند کلکتہ میں اس وقت ہندوستان کی مشہور علمی زبان اردو میں کوئی رسالہ نہیں نکلتا تھا اس رسالہ کے مقاصد بہت مفید ہیں۔ مولوی صاحب (مولا آزاد) کے نام سے ہمارے ناظرین خوب واقف ہیں۔ مخزن کے اوراق میں ان کے متعدد مضامین نکل چکے ہیں اس کے سوا انہیں ایڈیٹری سے بھی تعلق رہا ہے۔ کلکتہ کے ایک ہفتہ واری اخبار (احسن الاخبار) اور لکھنو کے مشہور رسالہ خدنگ نظر کی ترتیب کی خدمت دیر تک ان کے سپرد رہی ہے۔ ان کی ذاتی قدر ولیاقت اور واقفیت فن سے معلوم پڑتا ہے کہ یہ رسالہ اپنے مقاصد کو پورا کرسکے گا ہماری دعا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ (مولانا آزاد کی ادبی صحافت ص ۶۰)''

نوجوان صحافی مولانا آزاد کی عمر بھلے ہی اس وقت پندرہ سے سولہ برس سے زائد نہیں تھی۔ لیکن ان کے اعلیٰ خیالات، نصیحت آموز اور پرفکر تحریر نے بڑے بڑے صحافیوں اور قلم کاروں کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کیا بلکہ انہوں نے یہ محسوس کرلیا کہ اتنی کم عمر میں اتنی بلیغ صحافت اور سماج کے تئیں اتنے عظیم خیالات کسی عبقری شخصیت کے ہی ہوسکتے ہیں اور وہ انہیں داد دینے پر مجبور ہوگئے۔ آج کے وہ نوجوان جو زندگی میں کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں ان کے لیے مولانا آزاد کی شخصیت مشعل راہ ہے۔

ڈاکٹر محمد فریاد شعبۂ ترسیل عامہ وصحافت کے اسوسیئٹ پروفیسر ہیں۔

مولانا آزاد کا نظریہ تعلیم

ڈاکٹر شفاعت احمد

مولانا ابوالکلام آزاد ایک عظیم دانشور اور مفکر تھے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو عیاں ہوتے ہیں' وہ بیک وقت خطیب، مقرر، انشاء پرداز، مشہور عالم دین، جنگ آزادی کے مرد مجاہد اور جدید ہندوستان کے معمار تھے۔ ان کا خاندان علم وفضل اور رشد وہدایت کے ساتھ ساتھ حق وصداقت کا علم بردار رہا ہے۔ مولانا کے خاندان والے دہلی سے ترک وطن کر کے ۱۸۵۷ء سے پہلے عرب چلے گئے۔ ان کے والد محترم مولانا خیر الدین اپنے وقت کے ایک مشہور اور جید عالم دین تھے۔ اور جن کی مختلف موضوعات پر کئی کتابیں منظر عام پر آئیں اور کافی مقبول ہوئیں۔ مولانا آزاد کے والد کی شادی ایک عرب خاتون سے ہوئی جس کے بعد وہ عرب ہی میں قیام پذیر ہو گئے۔ مولانا کی پیدائش ۱۸۸۸ء میں مکہ میں ہوئی اور حرم ہی میں بسم اللہ خوانی ہوئی۔

مولانا آزاد بچپن ہی سے بہت ذہین تھے خود ان کا بیان ہے کہ میں جس چیز کو پڑھ لیتا ہوں ۴۰ سال بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ابھی ابھی پڑھا ہے جس کا ذکر انہوں نے ''غبار خاطر'' میں کیا ہے۔

مولانا آزاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ مختلف موضوعات پر طویل گفتگو کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آزاد کے تعلیمی نظریہ اور عصری معنویت کی افادیت آج برقرار ہے۔ آزاد نے اپنی تمام مصروفیات کی وجہ سے عام ماہرین تعلیم کی طرح اپنا کوئی مبسوط نظریہ پیش نہیں کیا۔ انہوں نے ملک وملّت اور دنیا کا مستقبل کس طرف اور کیسے گامزن ہو جیسے امور پر اپنے خیالات ونظریات کو پیش کرتے ہوئے بعض ایسی باتیں کہیں جن سے ہم تعلیم کے تمام شعبوں میں ان کی تجاویز سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مولانا نے تعلیم کے میدان میں خصوصی توجہ دی اور روایتی طریقہ تعلیم کے بجائے عصری تقاضوں اور مستقبل کے حوالے سے تعلیم کے مختلف پہلوؤں کی وکالت بھی کی۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم سے لیکر سیاست میں داخل ہونے تک ان کے مختلف خطبات، تحریری وتعلیمی افکار ونظریات سے استفادہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ جب وہ آزاد ہندوستان کے اوّلین وزیر تعلیم ہوئے اور انہوں نے جو تعلیمی نظریہ پیش کیا وہ بھی لائق مطالعہ ہے۔

مولانا نے گرچہ کسی کالج، یونیورسٹی اور درسگاہ سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن وہ بہت روشن خیال تھے۔ انہوں نے اساتذہ کے تعلیمی و سماجی رول وکردار کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح جدید ہندوستان میں ذریعہ تعلیم کے حوالے سے متوازی اور عملی نقطہ نظر پیش کیا۔ انہوں نے ہندی اور غیر ہندی کے مسئلے پر لوگوں کو جذبات کے بجائے عقل سے کام لینے کی تلقین کی اور افراط وتفریط کے خطروں سے بھی آگاہ کیا۔

مولانا' سائنس کا بخوبی استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سائنس کے ذریعہ انسان کو عملی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان ہے تو وہ سائنس کے ذریعہ صرف اور صرف انہیں اغراض ومقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جن کی بنیاد حیوانی جذبات اور جبلتوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ ذات الٰہی کا ایک پرتو ہے۔ تو سائنس کو بھی اللہ کی مشیت کی تکمیل کا وسیلہ بنائے گا۔ مولانا کا خیال تھا کہ ہماری تعلیم کی روح مشرقی اور ہندوستانی ہونی چاہئے تاکہ لوگ اپنے تہذیبی اقدار کو پہچانیں اور اس کے سرچشموں سے فیض حاصل کریں۔

ہندوستان کے قدیم وجدید، دانشوروں اور سیاستدانوں میں بہت کم لوگ ہیں جنہوں نے ایسے دوررس اور اہم کارنامے انجام دئے ہوں جو کام مولانا نے انجام دیئے ہیں۔ ان کی تلخیص کچھ اس طرح ہے (۱) تعلیم بالغاں کے تصورات (۲) چھ برس سے چودہ برس کے بچوں کی تعلیم کو لازم کرنا (۳) ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی سطح کو بلند کرنا (۴) مشرقی علوم وفنون اور ادب میں تحقیق اور ریسرچ کو فروغ دینا (۵) سائنسی تحقیقات اور تکنیکی تعلیم کے فروغ کے لئے دروازہ کھلے رکھنا (۶) سائنس اور تکنالوجی کی اصطلاحات کو قومی زبان (ہندی) میں منتقل کر کے بڑے پیمانے پر منصوبہ بنانا اور انگریزی تعلیم بالخصوص سائنس کے شعبوں میں انگریزی کے انحصار سے ہوشیاری کے ساتھ علیحدہ ہونے کی صورت پیدا کرنے کی کوشش قابلِ ذکر ہے۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک عالم ہی نہیں بلکہ ایک روشن خیال رہنما بھی تھے جنہوں نے قدیم علوم کے احیاء کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو بھی ضروری سمجھا تاکہ ہندوستانی قوم جدید تقاضوں کی تکمیل کر سکے لیکن افسوس کہ عصر حاضر میں نئی نسل کے نوجوان مولانا کے افکار ونظریات سے بہت دور ہو گئے۔ ان کو چاہئے کہ مولانا کی شخصیت اور علمی کارناموں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تعلیمی نظریات وخیالات سے استفادہ کریں۔

ڈاکٹر شفاعت احمد، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن دربھنگہ میں اسسٹنٹ پروفیسر
اور کامران مانو ماڈل اسکول، دربھنگہ کے پرنسپل ہیں

ہندوستان کے تعلیمی خاکے پر مولانا آزاد کے انمٹ نقوش

ڈاکٹر شکیل احمد حبیبی

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اپنے تعلیمی نظریات و افکار کے اعتبار سے اپنے عہد کے عام تعلیم یافتہ دانشور طبقے میں ممتاز اور نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ مولانا آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کے ایک ایسے معمار ہیں جنھوں نے اپنی منفرد تعلیمی بصیرت اور وسعت فکر ونظر سے اپنے بعد آنے والے تعلیم یافتہ طبقے کے فکری رجحانات اور تعلیمی اقدار کی تشکیل کی۔ مولانا نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اس سے تقریباً ایک صدی پہلے ہی ہندوستان میں پورا تعلیمی نظام بے جان ہوکر اپنی معنویت اور افادیت کھو چکا تھا۔ خاص طور پر تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق نے دینی اور عصری دونوں تعلیمی اداروں کو بے معنی اور غیر اہم بنا دیا تھا۔ مولانا آزاد کے نزدیک علم محض دینی علوم اور مغربی سیکولر علوم سے آگہی کا نام نہیں ہے بلکہ علم کا مقصد انسان کی ہمہ جہت ترقی اور نشوونما ہے۔ کیونکہ تعلیم کا مقصد فقط معاشی مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ انسان کی شخصیت کی مکمل تعمیر کا نام تعلیم ہے۔ مولانا آزاد ''علم کو خدا کی پاک امانت'' سمجھتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۵؍جنوری ۱۹۴۷ء سے ۲۲؍فروری ۱۹۵۸ء تک تقریباً گیارہ سال ہندوستان کے وزیر تعلیم رہے۔ انھوں نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ہندوستان میں تعلیم کے تقاضوں کو سمجھا اور منصوبہ بند طریقے سے آزاد ہند کی تعلیمی پالیسی کو ایک مثبت رخ دینے کی کامیاب کوشش کی اور ڈاکٹر تاراچند، پروفیسر ہمایوں کبیر اور خواجہ غلام السیّدین جیسے ماہرین تعلیم کے تعاون سے اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا۔ اس طرح مولانا نے آزاد ہندوستان کے تعلیمی نظام کی ایسی مستحکم اور مضبوط بنیادیں استوار کردیں جن کی وجہ سے آج ہمارا ملک دنیا کے نقشہ میں علوم وفنون میں مہارت اور سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کے اعتبار سے اپنی ایک نمایاں شناخت رکھتا ہے۔ یہ ایسی ہمہ گیر اور پائدار بنیادیں ہیں جو مستقبل میں اس راہ کے مسافروں کے لئے ہمیشہ سنگ میل کا کام کرتی رہیں گی۔

مولانا کی وزارت کے دور میں بنیادی تعلیم سبھی بچوں کے لئے مفت اور لازمی قرار دی گئی۔ بنیادی تعلیم کے اساتذہ کے لئے کالج کھولے گئے۔ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ اور سیکنڈری ایجوکیشن کی آل انڈیا کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ اساتذہ کی تقرری اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔ معذور بچوں کی تعلیم، تعلیم بالغان اور شبینہ اسکول کا انتظام کیا گیا اور اس سلسلے میں ریاستوں سے لے کر اقوام متحدہ کے عالمی ادارہ یونیسکو تک سے مدد لی گئی۔ اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لئے چنتامنی دیش مکھ کی نگرانی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم ہوا۔ اس ادارے نے مالی تعاون اور نظریاتی رہنمائی کے ذریعہ پورے ملک میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کا جال بچھا دیا۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں تعلیم کو وسعت دینے کے لئے شانتی سروپ بھٹناگر کی سربراہی میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ قائم ہوا۔ صنعت وٹکنالوجی میں کام کرنے والے سائنسی اداروں کے لئے انڈین کونسل فار ایگریکلچرل اینڈ سائنٹفک ریسرچ قائم ہوئی، زراعت اور دیہی ترقی کے لئے انڈین کونسل فار ایگریکلچرل ریسرچ بنایا گیا اور طب میں تحقیقات کے لئے انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ بنی۔ اس طرح پورے ملک میں اعلیٰ ترین سائنسی ریسرچ کے ادارے وجود میں آگئے۔

انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ اور انڈین کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ قائم ہوئیں۔ جن کے تحت تاریخ، معاشیات، اقتصادیات اور سماجیات جیسے علوم کو فروغ حاصل ہوا۔ مولانا کو تاریخ سے خاص مشغف تھا اور برطانوی مورخین کی لکھی ہوئی تاریخ کو غلط اور ملک کی سلامتی کے لئے خطرناک تصور کرتے تھے اسی وجہ سے مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند کی صدارت میں ماہر مورخین کی ایک کمیٹی کے ذریعہ آزادی کی تاریخ کو نئے سرے سے چار جلدوں میں لکھوا کر شائع کروایا۔

ہندوستانی تہذیب اور ثقافتی نیرنگیوں کو یکجا کرنے کی غرض سے انڈین کونسل فار کلچرل ریسرچ اور انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز اپنی سرپرستی میں شروع کی۔ اسی طرح نیشنل گیلری آف آرٹ، نیشنل میوزیم، نیشنل آرکائیوز، نیشنل لائبریری اور محکمہ آثار قدیمہ جیسے اہم اداروں پر بھی مولانا کی وزارت میں خصوصی توجہ دی گئی۔

مولانا آزاد خود بھی ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ ادبیات اور فنون لطیفہ کے فروغ کے لئے اپنی وزارت میں تین اہم اکادمیاں قائم کیں۔ ادب کے لئے ساہتیہ اکادمی، رقص وموسیقی کے لئے سنگیت ناٹک اکادمی اور مصوری کے لئے للت کلا اکادمی۔ یہ تینوں اکادمیاں مولانا کی سرپرستی اور سربراہی میں کام کررہی تھیں۔ ان اکادمیوں کے ذریعہ ہندوستانی ادیبوں کی تخلیقات کو علاقائی زبانوں میں شائع کیا جاتا اور اچھے تخلیق کار، مصور، موسیقار اور مجسمہ ساز کو انعام وکرام دیا جاتا تھا۔ ادب کے فروغ کے لئے ایک ادارہ نیشنل بک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کے تحت مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرکے کم قیمت پر لوگوں کو فراہم کی جاتی ہیں۔ اس طرح ان اداروں نے مختلف علاقوں کی تہذیب کو ادبی و فنی سانچہ میں ڈھال کر ملک کو قومی یکجہتی اور وحدت کی لڑی میں پرودیا۔

مولانا آزاد کی وزارت نے نہ صرف ہندوستانی تہذیب وثقافت کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے کی کوشش کی بلکہ دوسرے ممالک سے ثقافتی اور تمدنی رشتے استوار کرنے میں بھی اہم ذمہ داری نبھائی۔ اس مقصد کے لئے مولانا نے ایک طرف انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نامی ادارہ قائم کرکے ماہر اور ہونہار فنکاروں کو دیگر ممالک کے دورے کا موقع فراہم کیا اور دوسرے ممالک کے ایسے ماہرین کو اپنے یہاں مدعو بھی کیا۔ اس سلسلے کی ایک کوشش عربی مجلّہ ''ثقافۃ الہند'' عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری کیا۔

ڈاکٹر شکیل احمد حبیبی، آرٹس اینڈ سائنس کالج فار ویمن سری نگر، کشمیر میں اسلامک اسٹڈیز کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں

تعلیمِ نسواں کی اہمیت مولانا آزاد کی نظر میں

محترمہ وجیتا پرویز

انیسویں صدی کے آواخر میں ہی برطانوی نوآبادیات پر ضربیں پڑنے لگیں اور دنیا جمہوریت کے پھیلاؤ میں سرگرم عمل نظر آنے لگے۔ تعلیم کے یکساں مواقع اور برابری کے لئے جذبات ابھرنا شروع ہوئے۔ جنس اور معیشت دونوں آزادیوں نے اس دنیا کو جو نیا خواب دیا، اسی نے خواتین کو پدری نظامِ کائنات میں ایک کارگر رول انجام دینے کا موقع دیا۔ ایسے ہی موڑ پر مصر کے فرید وجدی کی عربی زبان میں تخلیق ''المراۃ المسلمہ'' جس میں عورتوں سے متعلق کئی سوالوں کو بالکل نئے خیالات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی تھی، مذہب کی روشنی میں ان کے جوابات بھی دئے گئے تھے۔ اس کتاب کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو میں ترجمہ کیا اور اس پر عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد عورتوں کے دفاع میں سب سے پہلے سائنسی تاویلات پیش کرتے ہیں۔ عورت اور مرد کی خداداد صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اگر آسمان سے تارے توڑ لانا مرد کی دسترس میں ہے تو عورتیں بھی یہ کام بہ سہولت کرسکتی ہیں۔ وہ یورپ کی نئی تعلیمی روشنی کا سہارا لیتے ہوئے عورتوں اور مردوں کے عدم مساوات کے سماجی فلسفے کو چیلنج کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے عورتوں کی تعلیم، پردے، ان کے حقوق غرض تمام موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ مولانا ابوالکلام کا مضمون ''تعلیمِ نسواں'' علی گڑھ میگزین کے نومبر 1903 کے خاص شمارے میں شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان تھا ''ہم اور ہماری خواتین'' اس مضمون میں مولانا آزاد عورتوں کی تعلیم کے بارے میں نہایت حوصلہ مندی سے نہ صرف اظہار خیال کرتے ہیں بلکہ مستقبل کے راستوں کی نشاندہی بھی فرماتے ہیں۔

عورتوں کی فلاح و بہبود کے تعلق سے مولانا آزاد کے تصورات جاننے کا ایک بہترین وسیلہ ''ترجمان القرآن'' ہے۔ خاص طور سے سورہء ''النساء'' کی تفسیر میں مولانا کے تصوّرات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ ایک عام غلط فہمی ہے کہ اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق مساوی نہیں ہیں۔ مولانا کو بھی یہ معلوم تھا کہ یہ غلط فہمی صداقت کی طرح لوگوں کے ذہن و دل میں موجود ہے۔ اس لئے قرآن کے ترجمے اور تفسیر دونوں میں ان مسئلوں پر مولانا نے اُن سوالوں کو زیرِ بحث لانے کی کوشش کی ہے جن پر باہم متضاد آرا ملتی ہیں۔ مولانا تفصیل سے دنیا کے بننے اور ترقی کرنے کے واقعات بیان کرتے ہوئے عورت اور مرد کی ضرورتوں اور تاریخی وقوعات پر متوجہ ہوئے ہیں۔ مولانا کو اندیشہ ہے کہ انھیں انھی روایتی مذہبی رہنماؤں کی طرح نہ سمجھ لیا جائے جنھوں نے قرآنی تعلیمات کو ایک بندھے ٹکے چوکھٹے میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا آزاد مذہب اسلام کی پیروی کرتے تھے اور قران وحدیث کی روشنی میں تمام مسائل حل کرنے کے پیروکار تھے۔ مگر وہ اس طرح ہرگز بیجا تقلید کے خواستگار نہیں تھے جو لوگوں نے اپنی سہولت کے اعتبار سے اپنی ضرورت کے مطابق ڈھال لی ہو۔ عورتوں کو کیسی تعلیم دی جائے اور اُس کے انتظامات کی صورت کیا ہو، اس پر بھی مولانا آزاد نے اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔

''تعلیمِ نسواں سے متعلق اس وقت تک جتنی رائیں شائع ہوئی ہیں، ان کا محصل یہ ہے کہ پرائیویٹ مکاتب جاری کئے جائیں یا ہر خاندان کے لئے علاحدہ علاحدہ مکتب بنادئے جائیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم سے عورتوں کو کون سا فائدہ حاصل ہوگا؟ اس تعلیم سے جس قدر لیاقت عورتوں کو حاصل ہوگی اس سے بدرجہا اچھی لیاقت قدیم خاندانوں کی خواتین میں موجود ہے۔ خود ہمارے خاندان میں ہر لڑکی کے لئے اردو فارسی اور دینیات کا پڑھنا لازمی ہے لیکن نہ اس سے وہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جس کی ہمیں تمنّا ہے، نہ ان کے دماغ روشن ہوتے ہیں، نہ ان کی اولاد پر اچھا اثر پڑتا ہے، نہ وہ اس کے دست و بازو ہوسکتی ہیں''۔ (علی گڑھ منتھلی نومبر 1903، (بہ حوالہ فکر و نظر، ابوالکلام آزاد نمبر 1989 تعلیم نسواں کی ابتدائی کوششیں اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ پرفیسر ثریّا حسین، صفحہ۔173)

مولانا آزاد کی شخصیت کوئی محتاج تعارف نہیں ہے۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کا عہدہ ملنا ہی کسی عام سیاست داں یا عام خیالات سے ہٹ کر کسی غیر معمولی شخص کی پہچان ہے۔ انہوں نے اس منصب کی لاج رکھی اور اس کا مان بڑھایا۔ کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود اور خواتین کو تعلیمی میدان میں بڑھاوا دینے میں ان کا خاصا اہم رول رہا ہے۔ آج اگر ملک کی آدھی سے زیادہ عورتیں تعلیم یافتہ ہیں اور دنوں دن اس میں اضافہ ہوتا جارہا ہے تو یہ انہیں کی مرہونِ منّت ہے۔ ہزاروں۔ لاکھوں کی تعداد میں اعلیٰ اور متوسط عہدوں پر عورتوں کی تقرری اس بات کی ضامن ہے کہ عورتوں نے اپنے حقوق کی پہچان کر لی ہیں اور وہ ملک وقوم کی خدمت میں کہیں پیچھے نہیں ہیں اور وہ مَردوں کے شانہ بشانہ ہو کر اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اس کے پیچھے مولانا آزاد کے ترقی پسندانہ اقدامات کا ہاتھ ہے جنھوں نے عورتوں کو جدید دنیا کی باگ ڈور دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور نہ ہی دوسرے لوگوں کی طرح کہیں کوئی حیلہ حوالہ کیا اور نہ کسی طرح کا کوئی گریز کیا بلکہ سیاسی، سماجی اور مذہبی تمام جہات سے عورتوں کی برابری کا اعلان کیا۔ آج اُسی بنیاد پر خواتین اپنی سماجی، تعلیمی، اقتصادی، سیاسی غرض ہر محاذ پر ثابت قدمی کا ثبوت دے رہی ہیں۔

محترمہ وجیتا پرویز کالج برائے تدریس اساتذہ، سنبھل کی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

مہاتما گاندھی کی یادگار

(گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے چند ہی روز بعد فروری 1948 میں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا تھا، جہاں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ اس جلسے کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی تھی۔ یہ ان کی صدارتی تقریر کا اقتباس ہے۔)

مہاتما گاندھی کی ہستی تاریخ عالم کی ان چنندہ ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حد بندیوں سے بلند تر تھے۔ اور ان کی نگاہ میں ہر قوم اور ہر وطن، ہر نسل اور ہر گروہ ایک ہی حیثیت رکھتا تھا۔ اور وہ ہر ایک کی خوبیوں کو اپناتے اور پسند کرتے تھے۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، مجھے ان کا تعارف سب سے پہلے 1908ء میں ہوا، جب کہ والد مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی، ٹرانسوال وغیرہ میں والد مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان اطراف میں ان کے بہت سے مریدین و معتقدین تھے۔ ان دنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دلچسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرم عمل تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام ملا جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ انہوں نے اس ٹیلی گرام میں والد مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اس کے بعد 1918 تک مجھے ان سے خط و کتابت یا زیارت و ملاقات کا موقع نہ ملا۔ 1918 میں جب میں رانچی جیل میں نظر بند تھا ان دنوں گاندھی جی بہار کے دورے کے لیے آئے اور انہوں نے ایک شخص کے ذریعہ مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں، اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد جب میں رانچی جیل سے رہا ہوا اور ایک جلسہ میں شرکت کے لیے 1920 کی 20 جنوری کو دہلی آیا، تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی سے نیاز حاصل ہوا۔ اس دن سے آج

تک جب کہ 1948 ہے، 28 برس گذر چکے ہیں۔ 28 برس کے یہ دن ہم پر ایسے گذرے ہیں کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔

اس موقع پر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے۔ وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیت میرے سامنے نہ آجائے، جو میرے دماغ پر چھا جائے اور میری گردن کو دبا لے، اس وقت تک وہ مجھے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا۔ ''میری گردن کی رگیں سخت ہیں۔'' میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے، تو پہلے میرا ذہن اس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لے۔ چنانچہ اب میں پہلی دفعہ مہاتما جیسے ملا، اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی جو انسان کی آنکھوں کو بند کر دیا کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کر دیا۔ اور جو دن گذرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں کو ان سے انتہائی قرب تھا اور ہمیں بہت طویل موقع ملا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھے، جس کا ہر ورق کھلا ہوا، ہر سطح روشن اور ہر لفظ دھلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا تھا۔

آج تمام دنیا میں شاید ان ہی کی زندگی ایسی تھی، جس کا ایک حرف بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ یہ انسانیت کی عظمت کے لیے سب سے بڑی کسوٹی ہے اور اس معیار پر اترنے والے تمام تاریخ انسانی میں صرف چند انسان ہوئے ہیں جنہیں آپ اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

جن کو تمام دنیا کی حد بندیوں نے الجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ الجھ نہ سکے۔ تمام بندشوں نے ان کا دامن پکڑنا چاہا، مگر وہ گرفت میں نہ آسکے۔ میرے نزدیک گاندھی جی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے۔

آج ہم ان کی کوئی بھی یادگار بنائیں، وہ نامکمل ہوگی۔ جب تک کہ وہ ان کی اس سربلندی کو ظاہر نہ کرے۔ اس لیے مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ گاندھی جی کی یادگار اس شکل میں ہونی چاہئے جو مہاتما جی کی اس سربلندی کو ظاہر کرے۔ آنے والی نسلوں کو اپنی خاموش زبان سے بتادے کہ مہاتما جی کا مشن اور مقصد حیات یہ تھا، جو دنیا بھر کے زائرین کو اپنی زبان حال سے گاندھی جی کی عظمت و بلندی کی تاریخ بتا سکے۔

آپ کتنی ہی یادگاریں بنالیں، لیکن وہ بیکار ہیں جب تک کہ ان کی انگلی اس عالمگیر سچائی کی طرف نہ اٹھے جو گاندھی جی کے پیش نظر تھی۔

(''خطباتِ آزاد'' مرتبہ مالک رام)

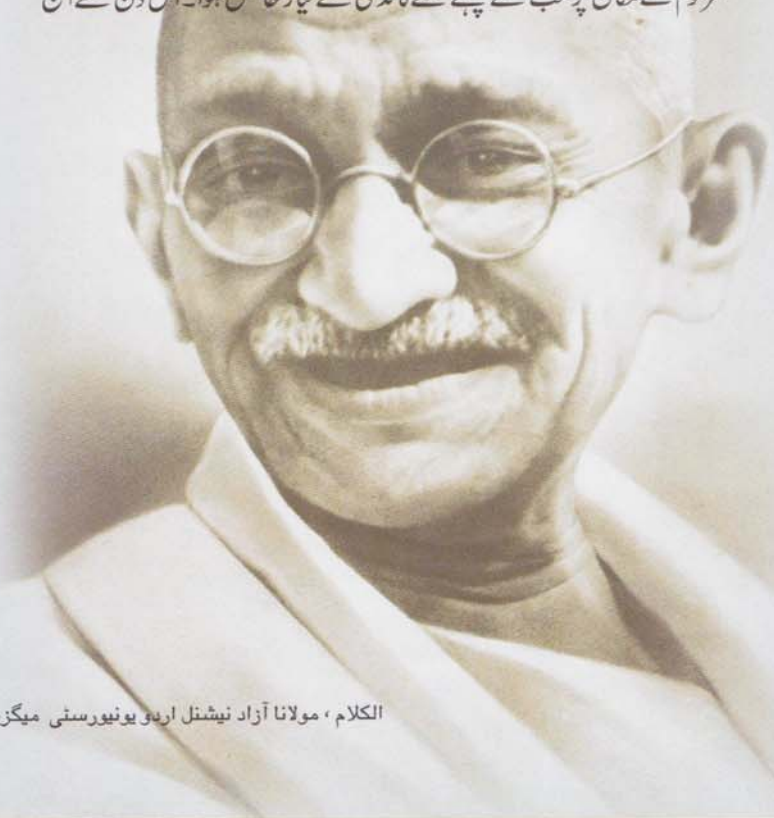

یوم آزاد تقاریب 2015

نومبر 4 - 13

Azad Day Celebrations 2015

NOVEMBER 4-13

یوم آزاد تقاریب 2015

نومبر 4 - 13

Azad Day Celebrations 2015

NOVEMBER 4-13